DUE DATE

Cl. No *Acc. No.*

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

مخزن

عوام ہند اور

اُن کی جانب سے غفلت

جبکہ عام طور پر دعوے کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستان
میں کشمیر سے راس کماری تک اور اودھ سے سندھ تک ایک وسیع پیمانہ
پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اس جزیرہ نما کی ہر قوم اور ہر گروہ
تعلیم نے بیچینی پیدا کر دی ہے تو حیرت ہو گی اگر یہ کہا جائے
ا رے مصلحان ملک وطنی ترقی کی طرف سے غافل ہیں۔
آمادہ نہیں ہیں کہ صرف اُس کو ترقی کے آثار اور مبارک بیداری
نہیں کہ ادھر اُدھر غل مچا دیا چند لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے
یں پاس کر دیں اور بس ہماری رفتار ترقی کی جانب شروع ہو گئی۔
ہم الشان جزیرہ نما میں جس کو بجائے خود ایک برِاعظم کہا جا سکتا ہے
ں مردم شماری تیس کروڑ سے زاید ہے صرف چند ہزار آدمی
ہا اتفاق کرنے لگیں حالانکہ اپنے پیارے وطن کی جانب سے
... کی بیداری نہیں کہی جا سکتی۔ جبتک کہ ... سے
... کے آثار ...

ہر طبقہ میں پیدا نہ ہو جائیں۔ جبتک کہ ہر گروہ اپنے ملک کی جانب سے پورے طور پر واقف نہ ہو جائے جبتک کہ تمام باشندے اپنی پستی کو محسوس نہ کرنے لگیں اور جبتک کہ ادنےٰ مزدور سے اعلےٰ طبقہ کے لوگوں تک باہمی ہمدردی نہ پیدا ہو جائے اور پورے اتفاق سے ملکی ترقی میں کوشش نہ کرنے لگیں اُس وقت تک یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اہل ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے۔

ہندوستان چند صوبوں پر منقسم ہے صوبہ جات کمشنریوں سے مرکب ہیں کمشنری اضلاع سے اور اضلاع دیہات سے مرکب ہیں تاآنکہ صوبہ جات سے لیکر دیہات تک یکساں ہر فرد بشر کو ملکی ترقی کی فکر نہ پیدا ہو جائے اُس وقت تک ہم تو اُن کو "وسیع پیمانہ پر ملکی بیداری کے آثار" نہیں کہینگے تم چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاؤ اور وہاں کے نیم برہنہ باشندوں کی حالت دیکھکر جو ہندی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے اُن غریبوں کو شائد یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ لفظ ترقی کس جانور کا نام ہے اور ملک کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ اگر کسی دیہاتی سے دریافت کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ملک کا اطلاق اپنے گرد نواح کے دس یا پانچ دیہات پر کریگا اور بس۔ اس دیہی آبادی کا سب سے بڑا بوجھ بجھکڑ وہ ہوگا جو اُن دو دریاؤں کے نام سے واقف ہوگا۔ جنکے درمیان میں وہ قریہ واقع ہے، وہ جب کسی کی تعریف یا مذمت کریگا تو کہیگا "گنگا جمنا کے بیچ میں ایسا آدمی نہیں ہے" جس عام طور پر زبان زد ہو کہ "گنگا سے آگے دلیسی نہیں ہے" اُس ملک کا مبلغ معلوم۔ ہم ملکی مصلحوں سے دریافت کرتے ہیں کہ

ہیے اس کثیر آبادی کی اصلاح کی کیا کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟ ان کی تربیت
کے واسطے کتنی انجمنیں بنائی ہیں کتنے دیہاتی نرری اسکول جاری کئے ہیں۔
ان قریہ جات کے باشندوں کی اولاد تعلیم حاصل کرے کیا کیا ایسی تدبیر
کی ہیں جن سے ان لوگوں کو نوشت و خواند کی جانب رغبت ہو اور
نا ایسا کم قیمت لیٹریچر مہیا کیا ہے اور اخبار جاری کئے ہیں جنکے ذریعہ سے
دیہاتی باشندوں کو دنیا کی حالت اپنے ملک کی حالت اور اپنے ادبار سے
آگاہی حاصل ہو۔ اور آگے بڑہنے کا ان کو خیال پیدا ہو جائے۔ تمہارے
ان سوالوں کا جواب ضرور تم کو نفی میں ملیگا۔ جب یہ حالت ہے یہ کس طرح
کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے
ہیں آپ ذرا ترقی یافتہ ممالک کی سیر کیجئے اور اٹلی ہی کو دیکھئے جو ترقی
کے لحاظ سے یورپ میں کم درجہ پر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ہر جگہ آپ
اخبارات کے کلب پائینگے اور کثرت سے سستا لٹریچر آپ کو وہاں نظر
آئیگا جسکو ادنے سے ادنے باشندۂ ملک خرید سکے اور اس کے ذریعہ سے
اپنی واقفیت بڑہا سکے، تم کوئی مزدور کوئی گاڑیبان اور کوئی خدمتگار
ایسا کم دیکھوگے جو ذرا فرصت ملنے پر اس سلسلۂ لٹریچر سے فائدہ نہ اٹھاتا
ہو۔ آپ انگلستان جائیے اور کسی پورٹروں یا گاڑی بانوں کے
کلب کو دیکھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ وہ مزدور جو ابھی ایک شلنگ مزدوری
لیکر آپکا گلیڈ اسٹن بیگ دو فرلانگ تک لے گیا ہے۔ کس درجہ کی مضبوط
دلائل کے ساتھ گورنمنٹ کی پالسی پر نکتہ چینی کرتا ہے اور اپنی قوم اور
سلطنت و ملک سے اس کو کس قدر واقفیت حاصل ہے۔ آپ دیکھئے کہ یورپ
میں ان کی ہم قوموں نے اپنے ادنے درجہ کے ہم قوموں کی تعلیم اور واقفیت

بڑھانے کا کیسا انتظام کر رکھا ہے - وہاں کی ادنے آبادی کے واسطے جداگانہ سکول ہیں جداگانہ کلب ہیں جداگانہ لائبریریاں ہیں اور جداگانہ سلسلے اخبارات کے ہیں اس حالت پر بھی وہ لوگ مطمئن نہیں ہیں اور ابھی تک ذرائع ترقی کی تلاش میں مصروف ہیں - یہ کہا جائیگا کہ یورپ میں تعلیم جبری ہے مگر ہم اُس کا یہ جواب دے سکتے ہیں - کہ وہاں جبری تعلیم تب ہی ہوئی جبکہ ملک میں تعلیم کی جانب عام فیلنگ پیدا ہو گیا ہم دریافت کرینگے کہ دیہی آبادی میں ایسا فیلنگ پیدا کرنے کی کس قدر کوشش کی جاتی ہے اور کتنے ہمارے لکچرار صاحبوں نے اپنے کو وقف کر رکھا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاکر اپنے برادرانِ وطن کو تلقین کرینگے اور تعلیم کی جانب ان کو مائل کرینگے - شہروں اور قصبوں میں لکچر بازی کرنا اور ایسے اخبارات میں مضامین لکھنا جنسے ہماری آبادی کا عظیم الشان حصہ بالکل ناواقف ہے ملکی ترقی کے واسطے ہرگز کافی نہیں کہا جا سکتا +

ہماری آبادی کا یہ ادنے ترین حصہ جنکی طرف سے ہم اس درجہ غافل ہیں اگر نظرِ تعمق سے دیکھا جائے تو ملک کا تمام دار و مدار اور انتظام اسی ادنے آبادی کے ہاتھوں میں ہے - یہاں نیم برہنہ کاشتکار اپنے خون پانی کی محنت سے زمین سے پیداوار کی کوشش کرتے ہیں - اور اس ذریعہ سے سلطنت کے خزانہ میں کروڑہا روپیہ داخل ہوتا ہے - انہی چھوٹے لوگوں میں اگر کوئی شخص تھوڑا بہت لکھ پڑھ جاتا ہے - تو ضروری چھوٹے چھوٹے امتحانات دیکر گورنمنٹ کی جانب سے کسی گاؤں کی نگرانی اُس کی سپرد ہو جاتی ہے جس کی زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی ہے - یہی ایک شخص ہے جس کے قبضہ میں ملک کی مالی حالت دکھانا ہے کہ جس طرح چاہے

ں کو ظاہر کرے ملک کی مزروعہ یا غیر مزروعہ رقبہ کے اعداد اگر غلہ کی سنہ
؛ ہو تو اُس کے اعداد اپنے قریہ سے یہی بنا کر افسران بالا کو بھیجتا ہے
ہی بڑے بڑے نقشہ جات مرتب کئے جاتے ہیں حکام کی غلط یادداشت
ہی چھوٹا سا اہلکار ضروری معلومات مہیا کرتا ہے غرض اگر غور کیجئے
ہماری نظر سے قریہ سے لیکر گورنمنٹ آف انڈیا تک ایسی ایک چھوٹے
ے اہلکار کا ظہورا ہے مگر ملک کا ایسا اہم اور ضروری جزو اگر اس کی
علومات کی تحقیقات کی جائے تو کمشنری سے آگے نہیں بڑھتی اور ملکی
ت اور اُس کی ترقی یا تنزل کو نہ تو یہ شخص سمجھتا ہے اور نہ اُس کو اُس سے دلچسپی
ایسے شخص سے یہ اُمید کیجا سکتی ہے کہ گورنمنٹ کو معلومات مہیا کرتے
ت وہ ملکی حالت کا پوری ایمانداری کے ساتھ لحاظ کریگا اور جبکہ یہ کیفیت
ہے تو کیا ہمارا یہ دعوے کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا
گئے ہیں ٹھیک ہو سکتا ہے +

ہمارے ہندوستان کے تو خمیر میں داخل ہے کہ باشندوں کی حیثیت میں
ق کیا جائے۔ یہاں اصولاً اہل ملک کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور غریب
ودر صرف اس گناہ کی عوض سے کہ وہ کم حیثیت گھر میں کیوں پیدا ہوا اس
بل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ برہمن کے ہم حیثیت ہونے کا دعوے کرے۔
مسلمانوں کے اصول میں داخل تھا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو برابر
سمجھیں، اُن کے قرآن میں صاف کہا گیا تھا کُلُّ مُؤمِنٌ اِخوَۃٌ مگر ہندوستان
ں آکر تفریق کا مرض اُن کو بھی چمٹ گیا اور مساوات کا مبارک اصول اُنسے
ی اُٹھ گیا۔ جس ملک میں صدیوں کی مسلسل حقارت سے ایک عظیم الشان
مہ آبادی اپنے کو پست سمجھنے لگے اور ذہن نشین کرے کہ ہم اُن سے

بڑ ہانے کا کیسا انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں کی ادنے آبادی کے واسطے جداگانہ سکول ہیں جداگانہ کلب ہیں جداگانہ لائبریریاں ہیں اور جداگانہ سلسلے اخبارات کے ہیں اس حالت پر بھی وہ لوگ مطمئن نہیں ہیں اور ابھی تک ذرائع ترقی کی تلاش میں مصروف ہیں۔ یہ کہا جائیگا کہ یورپ میں تعلیم جبری ہے مگر ہم اُس کا یہ جواب دے سکتے ہیں۔ کہ وہاں جبری تعلیم تب ہی ہوئی جبکہ ملک میں تعلیم کی جانب عام فیلنگ پیدا ہو گیا ہم دریافت کرینگے کہ وہی آبادی میں ایسا فیلنگ پیدا کرنے کی کس قدر کوشش کی جاتی ہے اور کتنے ہمارے لکچرار صاحبوں نے اپنے کو وقف کر رکھا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دیہات میں جاکر اپنے برادرانِ وطن کو تلقین کرینگے اور تعلیم کی جانب اُن کو مائل کرینگے۔ شہروں اور قصبوں میں لکچر بازی کرنا اور ایسے اخبارات میں مضامین لکھنا جنسے ہماری آبادی کا عظیم الشان حصہ بالکل ناواقف ہے ملکی ترقی کے واسطے ہرگز کافی نہیں کہا جا سکتا +

ہماری آبادی کا یہ ادنے ترین حصہ جنکی طرف سے ہم اس درجہ غافل ہیں اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو ملک کا تمام دارمدار اور انتظام اسی ادنیٰ آبادی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہاں نیم برہنہ کاشتکار اپنے خون پانی کی محنت سے زمین سے پیداوار کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس ذریعہ سے سلطنت کے خزانہ میں کروڑہا روپیہ داخل ہوتا ہے۔ انہی چھوٹے لوگوں میں اگر کوئی شخص تھوڑا بہت لکھ پڑھ جاتا ہے۔ تو مزدری چھوٹے چھوٹے امتحانات دیکر گورنمنٹ کی جانب سے کسی گاؤں کی نگرانی اُس کی سپرد ہو جاتی ہے جس کی زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ہوتی ہے۔ یہی ایک شخص ہے جس کے قبضہ میں ملک کی مالی حالت دکھانا ہے کہ جس طرح چاہے

اُس کو ظاہر کرے ملک کی مزروعہ یا غیر مزروعہ رقبہ کے اعداد اگر غلط نہیں تو فقط ہو تو اُس کے اعداد اپنے قریہ سے یہی بنا کر افسران بالا کو بھیجتا ہے جن سے بڑے بڑے نقشہ جات مرتب کئے جاتے ہیں حکام کی طلبداشت پر یہی چھوٹا سا اہلکار ضروری معلومات مہیا کرتا ہے غرض اگر غور کیجئے تو ہماری نظر سے قریہ سے لیکر گورنمنٹ آف انڈیا تک ایسی ایک چھوٹے سے اہلکار کا ظہور ہے مگر ملک کا ایسا اہم اور ضروری جزو اگر اُس کی معلومات کی تحقیقات کی جائے تو کمشنری سے آگے نہیں بڑھتی اور ملکی حالات اور اُس کی ترقی یا تنزل کو نہ تو یہ شخص سمجھتا ہے اور نہ اُس کو اُس سے دلچسپی کیا ایسے شخص سے یہ امید کیجا سکتی ہے کہ گورنمنٹ کو معلومات مہیا کرتے وقت وہ ملکی حالت کا پوری ایمانداری کے ساتھ لحاظ کریگا اور جبکہ یہ کیفیت ہے تو کیا ہمارا یہ دعوے کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں ٹھیک ہو سکتا ہے +

ہمارے ہندوستان کے تو خمیر میں داخل ہے کہ باشندوں کی حیثیت میں فرق کیا جائے۔ یہاں اصولاً اہل ملک کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور غریب شودر صرف اس گناہ کی عوض کہ وہ کم حیثیت گھر میں کیوں پیدا ہوا اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ برہمن کے ہم حیثیت ہونے کا دعوے کرے۔ گو مسلمانوں کے اصول میں داخل تھا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو برابر سمجھیں، اُن کے قرآن میں صاف کہا گیا تھا کُلُّ مُؤمِنٍ اِخوَۃٌ مگر ہندوستان میں آکر تفریق کا مرض اُن کو بھی چمٹ گیا اور مساوات کا مبارک اصول اُن سے بھی اُٹھ گیا۔ جس ملک میں صدیوں کی مسلسل حقارت سے ایک عظیم الشان حصہ آبادی اپنے کو پست سمجھنے لگے اور ذہن نشین کرے کہ ہم اُن سے

زیادہ بڑھ ہی نہیں سکتے اور اس ملک کے مصلح اس گروہ کی جانب سے قطعاً غافل ہوں پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے - آپ یورپ میں جا دیکھیں جہاں ایک چرواہا اور ایک مزدور سمجھتا ہے کہ اگر وہ کوشش کریگا تو جمیس واٹسن اور کیئر ہارڈی ہو سکتا ہے اور جہاں مساوات کا اس قدر خیال ہے کہ اگر سیاہ ٹوپی مروج ہوگی تو ہر ایک سر پر آپ سیاہ ہی ٹوپی دیکھیں گے خواہ وہ مسٹر اسکوتھ کا ہو یا ایک مزدور کا - یہ علامات ہیں جن سے کسی ملک کو "سچ بیدار" یا مائل ترقی کہا جا سکتا ہے - جبتک کہ ملک میں زور شور سے مساوات کے خیالات پیدا نہ ہو جائینگے، جبتک کہ ہر ایک ہندوستانی دوسرے کو مساوی نہ سمجھنے لگیگا، جبتک کہ نیچے کے درجے کے لوگوں کی اصلاح کی جانب مصلحان ملک کی توجہ نہ مائل ہوگی اور شودروں تک کے خیالات میں یہ بات پیدا نہ کیجائیگی کہ ہم لوگ بھی برہمن ہی کی مثل حقوق حاصل کر سکتے ہیں - اس وقت تک یہ دعوے کرنا کہ ملک میں وسیع پیمانہ پر بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں" اور "ملک کی رفتار ترقی کی جانب ہے" بہت قبل از وقت ہے +

حاجی محمد موسیٰ خان علیگڈھ

امید وہ جوہر ہے جس کے بل پر دکھیا اور مصیبت زدہ اپنی زندگی کے دن کاٹتے ہیں - امید طوفان میں روح کا لنگر بنتی ہے اور مشک کی طرح سہارا دیکر انسان کو مایوسی کے گہرے پانی میں ڈوبنے سے بچاتی ہے اور جب موت کنڈی کھڑکھڑاتی ہو اس وقت بھی آدمی کی ہمت بندھا کر اُسے زندہ رکھتی ہے +

قافلہ

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

اللہ اللہ اس خاک پاک امریکہ کا کیا کہنا۔ اس سرزمین سے جو اُٹھتا ہے فرزانہ و نوآہنگ۔ آزادہ روی و نازک اندیشی میں یکتا۔ پرانی دنیا اگر جدت پرست تھی تو "نئی دنیا" جدت پرستی کی سب سے اچھی مثال لاسکتی ہے۔ برازیل کا عربی اخبار المنار جو خاص پایہ تخت جمہوریہ سے شایع ہوتا ہے ناقل ہے کہ قافلہ کے نام سے وہاں جنوبی امریکہ میں جدید تحریک ہو کر ایک جماعت قایم ہوئی ہے جس نے عرب کی رسم و رواج پارینہ کا احیا اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے۔ اس زندہ دل انجمن کے معینہ اوقات پر جلسے ہوتے ہیں اور یاران ہمدم باہم مل جل کر وہی مدارات و تواضع برتتے ہیں جو اہل عرب کا قدیم سے شیوہ ہے۔ وہی انداز وہی اخلاق وہی مراسم اختیار کیے گئے ہیں جو اس طیلسان پوش قوم کے مایۂ ناز رہے ہیں +

اس شہر کے اکثر مشہور انشا پرداز اور نامور اہل قلم اس سلسلہ میں داخل ہیں جن کا مقصود اصلی نہ صرف تفنّن و ظرافت طبع ہے بلکہ روح عربیت کا نمو نما یہی وجہ "قافلہ" نام رکھنے کی ہے۔ اسکی مقدمۃ الجیش یا سرگرم کارکن کوالیونتو اور آدولا فو بیلاک ہیں۔ پہلا اگر شیوا بیانی و سحر طرازی میں مشاق زباندانی و علم لغت میں یگانہ ہے تو دوسرا بھی اخلاق نگاری و تہذیب آموزی میں نظیر نہیں رکھتا۔ اس مجلس کا ایک کارخانہ ہماری نگاہ سے بھی گذرا جس کو دیکھکر عجب لطف سو سرور حاصل ہوا۔ روح عربیت نے اپنی جھلک دکھا دی۔ تہامہ سے لبنا

مروت و محبت کے خلاف سمجھ کر احباب صافی مذاق کی تفریح و تفنن کے لئے اُس کا اعادہ کیا جاتا ہے +

ہر شخص جو اس جماعت میں شامل ہو "بدوی" کہلاتا ہے اور اُس کو اس سوسائٹی کی صحبتوں میں اُسی بادیہ نشین وصحرانورد گروہ کا طریقہ انجام دینا ہوتا ہے۔ پچھلی مرتبہ اس جمعیت کا تیسرا عشا (ڈنر) اوتل غلوبو (گلوب ہوٹل) میں دیا گیا تھا۔ سو بدوی شریک تھے منتظم و سربزم اولانوبیلا ایک خود تھا۔ مٹی اور ٹھیکریوں کے ڈھیر سے اونٹ بنا کر اُن کی پشتوں پر نہایت خوش سلیقگی سے مائدہ (میزوں) کی آرائش و تزئین بنفشہ کی غنچوں سے کی گئی تھی۔ جس سے خوانہائے نعمت و عطایائے قدرت کی رونق و شان دوبالا ہوگئی تھی۔ ہر مہمان کے روبرو پیالہ کے پیچھے ایک ایک سربمہر لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ لفافے کھولے گئے تو اُن میں سے لائحہ طعام (مینو) نکلا۔ یہ بےتکلف ورق پر بزرگ کو آلیونتو کی تصویر نمایاں تھی بدوؤں کے لباس میں ایک اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے۔ پھر یہ عبارت تحریر تھی +

مقامہ سوم۔ زیر سایہ شبستان غلوبو۔ ماہ رمضان کی تیسری مبارک شب ۱۳۲۵ھ (۱۵ اکتوبر ۱۹۰۷ء) +

شوربہ بلخ ہای بجد۔ ماہئی قلزم احمر کے کباب جو ریگ لیبیا پر بٹھائے ہنگ سے بریاں کی گئی شتر سفید کم عمر کی ران بحیرۂ شاد (چاڈ) کے ساحل سے چھتی والے شتر مرغ صنعا کی ساگ و ترکاریاں جو ہیکل جوپیٹر کے ویرانہ کے حوالی سے لیگئی ہیں۔ ایک یمنی میوہ۔ شیر ناقہ کا پنیر۔ بادۂ بت پرستان جسکا ایک جام بےتامل پی لینا واجب بلکہ لازم ہے +

اے اہل ارض رنگ ہمارا اُڑا لیو
تقلید میں بھی تا کہ ہو ایجاد کا مزا

(مقبول)

سودائے سنگین

فرامرز مرزبان جمشید جی سے، بمبئی کے قلابہ اسٹیشن پر اتفاقاً ملاقات ہوئی اور اس ملاقات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا سال بھر سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس عرصہ میں اسمیں کسقدر تغیر ہوگیا تھا! اس وقت، اس کے ہلکے چہرے کے اداس رنگ پر مسرتِ شباب کا غازۂ گلگوں پھرا ہوا تھا! آج ایک انجماد خیز سانولے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اسکی ہلکی سرخی مائل مونچھوں میں۔ جنہیں اس وقت وہ کاسمیٹک لگا لگا کے فوجی ڈھنگ پر سیدھی اور نوکدار بنایا کرتا تھا، اور جیسے اس کے چہرے کی زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار پیدا ہوجاتا تھا۔ آج ایک پریشانی تھی، اور اضطراب کی تکلیف دہ کیفیت کیساتھ ملے ہوئے ہونٹوں پر ایک تھکن برس رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نوجوان پر بھی جو ہمیشہ بنے سنورے رہنے کے لئے مشہور تھا زندگی کی کسالتِ غم چھا گئی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ مجھے دیکھ کے خوش ہوگا۔ برخلاف اس کے میں نے دیکھا کہ اس اتفاقیہ ملاقات سے جسمیں اسے مجھ سے بات کرنی پڑی گی وہ بیزار معلوم ہوتا تھا۔ ذرا سا ہٹ کے میرے بیٹھنے کے لئے اس نے بنچ پر جگہ دی، اس لئے کہ قواعد اخلاق کی یہی لذت صریح نہ ہو۔ اسکے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پیدا ہوئی مگر پیدا ہوتے ہی مرگئی۔

یہ پر اجتناب طرزِ قبول ایسی نہ تھی کہ مجھے اس بات کی ہمت دلائی کریں

اپنی پرانی عادت کے موافق "تم" سے اُسے خطاب کرنا، اسلئے میں نے کہا:

"میں ہوں میں آپ سے تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔"

ہاں کہا اور یہ کہکے اپنی بائیں کہنی کو بنچ کے تختے پر ٹیک کے بیٹھ گیا، نگاہ نیچے پتھروں پر گاڑ دی، اور سگرٹ کی راکھ گرانے کے لئے سگرٹ پر اپنی انگلی آہستہ آہستہ مارنے لگا۔

نگاہ تو اس کام پر، مگر خیال کہیں اور، اس حالت میں اُسنے اپنا فقرہ جاری رکھا:

"ہاں پچھلے سال اُس واقعہ کے بعد، میں والدہ کے ساتھ بمبئی آیا تھا، اُس وقت سے اب تک بند رہ میں ہیں کبھی یہاں آتے ہی نہیں، آج کا آنا مستثنیٰ سمجھنا۔

کس واقعہ کا مجھ سے ذکر کر رہا تھا؟

ٹوٹے ٹوٹے فقرے کہتا تھا، آنکھیں سگرٹ سے نہ ہٹاتا تھا۔ پھر گویا اس بات سے متعجب ہو کر کہ ایک ہی دفعہ اس قدر باتیں کر گیا، وہ یکایک اپنے فقرے کو تمام کئے بغیر رک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجوان جسکی تمام گذشتہ زندگی مجھے معلوم تھی، یاس کی ہوائے گراں سے بیتاب ہے۔

یہ نوجوان جو ہمیشہ متبسم و ظریف رہتا تھا یہانتک کہ اپنے آلام عاشقانہ میں بھی کوئی ایسی حکایت ضرور کہتا جو تمہیں خوش کرتی، اپنی سب سے زیادہ یاس انگیز حسیات و کیفیات کی رقیق اور پرتاثیر زبان سے تصویر کھینچتے ہوئے، یہ دیکھکر کہ اُس کی سرگذشت تمہارے دل میں رقت پیدا کرنے کو ہے، ایک نہایت ہی چھوٹا سا لطیفہ اپنی سرگذشت میں غیر معلوم طریقہ سے داخل کر کے، تمہارے مونہہ سے ضرور ہی قہقہہ نکال لیتا، غرضکہ یہ ہمیشہ لطیف و شوخ، ہمیشہ متاثر، لیکن ساتھ ہی ہمیشہ ہنسنے ہنسانے کے

بہانے ڈھونڈھنے والا نوجوان، اسوقت کے الھڑ سے اُلھڑے سنجیدہ خیالات میں مستغرق نوجوان سے اس قدر دور نظر آتا تھا کہ . . . . .

فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ یہ اک شاعر تھا۔ حساً و فکراً شاعر اگرچہ لساناً نہو۔ اپنی تمام ہیئت معنویہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو نوشعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادیات کے تھپیڑوں کے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں حالانکہ اُن کا خستہ و مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا . . . مگر اس کی طبیعت میں ایک میلان نشوو نما کہ سب سے زیادہ مکدر زمانے میں اپنے پُر ملال چہرے پر اک مسکراہٹ ضرور رکھتا تھا۔ اس تبسم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اسے زندگی کی مادیات سے جب پالا پڑتا ہے تو اُن کے یقین نہ کرنے میں ثابت قدم رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے۔ خود کہا بھی یہی کرتا تھا "زندگی میں سے موسیقی اور شعر، پھول اور روشنی، اور پھر ان سب کا مجموعہ ان سب کا ماحصل عورت کو نکال ڈالو پھر دیکھیں کیونکر دنیا میں زندہ رہنے کی جرأت اپنی میں پاتے ہو؟"

اگر زندگی انھیں چیزوں سے عبارت ہوتی اور اُن کی حقیقت بھی صرف تخیل سے مترکب ہوتی تو ہم سب کتنے خوش قسمت ہوتے۔ مگر یہ رنگین چیزیں۔ ہوائیں اور رنگ، کہ اُڑ جاتی ہیں غائب ہوجاتی ہیں اور یہ عورتیں؟ کتاب حیات کی اس جلد کو ایک جلد زر اندود کی شکل میں دور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے، اس کے بابوں اور صفحوں کو جو آنسو دل سے لکھے گئے ہیں ابھی دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت

معلوم نہیں ہوئی تھی، کہ زندگی میں شعر ایک نوحہ ماتم موسیقی، اک فغان یاس، پھول، ایک منجمد قطرۂ گریہ، روشنی، اک امید گریزاں کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ابھی اُسنے یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اُس سراب کی مانند ہے کہ ڈھونڈھو مگر نہیں ملتی، دکھائی دیتا معلوم ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔

پہلے اُس سے ہفتہ میں اک دفعہ تو ضرور ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ملاقات کا زمانہ گذرے ہوئے زمانے کی تلافی کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اس ملاقات میں اپنی زندگی کے ۔ اپنی عاشقانہ زندگی کے، وہ کوئی دوسری زندگی سے واقف ہی نہ تھا ۔ تمام صفحوں کو مجھے دکھاتا سات آٹھ مصرعوں میں اس ملاقات اور پچھلی ملاقات کے درمیان کے زمانہ کی تاریخ سنا دیتا۔ کبھی ایک لفظ ہی ایک ہفتہ کی رپورٹ سنانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یہانتک کہ بعض مرتبہ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے دیکھکر اُس کا خوش خوش مسکرانا یا منہہ بنانا مجھے کل حال بتا دیتا تھا۔

یہ رازکہنا اور سننا، کس طرح اور خاصکر کس لئے شروع ہوا تھا؟

مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ مجھے اپنا رازدار بنانے کی عادت کی ابتدا اُس نے اس طرح کی تھی:

ایک دن صبح ۔ آج کی غتدا یہ سٹیشن کی ملاقات سے پانچ سال قبل ۔ اپالو بندر پر میں نے اسے دیکھا۔ اپالو بندر پر صبح کے وقت اُس کا ہونا اُس کی زندگی کے لحاظ سے ذرا عجیب شے تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مجھے اُسکی وجہ بتائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دن اُس کی طبیعت میں باتیں کرنے کا بہت جوش تھا، اور چونکہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جس سے وہ دل بھر کے باتیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ مجھسے کہنے لگا:

بھائی کیا اچھا ہوا تم مل گئے. تم سے مشورہ کرونگا. مجھے ایک شادی کے لئے ایک ہدیہ تیار کرنے کی ضرورت ہے (کہتے وقت ہنسنے اور اپنے تئیں بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا) ہمارے عزیزوں میں سے ایک لڑکی بیاہی جانے والی ہے. اس کے مناسب ایک ہدیہ تیار کرنے کے لئے میں نے کس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالا اور انتخاب کرنے تک کن مشکلوں کا سامنا ہوا. پہلے میں نے چاہا کہ کوئی جڑاؤ زیور دوں مثلاً ایک فیروزہ یا عقیق کی انگوٹھی یا ایک ننھی سی سونے کی سینے پر لگائی جانے والی گھڑی. مگر میں نے اس خیال کو چھوڑ دیا. کیونکہ ان چیزوں کے دینے میں کوئی نزاکت طبع ظاہر نہیں ہوتی ان چیزوں کے دینے کے یہ معنے ہوتے کہ میں اس کے مذاق پر نکما سا اثر ڈالنا چاہتا ہوں. "ایسی انگوٹھی پہنو، ویسی گھڑی لگاؤ" کے قبیل سے اسپر ایک دباؤ ڈالنا ہوا. اس کے علاوہ اس میں ایک خواہش نمائش بھی تو پائی ہوتی. گویا میں (میری چیز وہ ایک ہی بات ہے) اس کی انگلیوں میں، اس کے سینے پر نظر آؤں. سچ پوچھو تو اس میں ایک گنوارپن کا پہلو بھی تو نکلتا ہے. ہے نا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک تحفہ دینا جس کی قیمت بھی اس پر کندہ ہو. یہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتیں. دیکھنے والے آنکتے اس انگوٹھی کی لاگت پچاس روپیہ کی ہوگی، یہ گھڑی ڈیڑھ سو کی ہوگی."

یہ فرامرز جمشید جی، جو اسدن اپولو بندر میں کھڑا، کبھی اس پاؤں پر زور دے کے کبھی اس پاؤں پر، اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہایت فصاحت سے بیان کر رہا تھا، اور فلسفہ ہدایا پر لکچر دے رہا تھا، پانچ سال بعد اس بڈھے نوجوان سے کتنا آگے کس قدر دور نظر آتا تھا جو سر نیچا کئے،

رنجیدہ شکل میں سگرٹ کی راکھ گرا رہا تھا اور مجھے آنکھیں نہ ملنی چاہتا تھا۔
غرضیکہ اُسدن فلسفہ بدایا پر لکچر دیتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"میں نے پھر ایک اور چیز سوچی۔ انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیوں کا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی جو مل سکیں۔ تاج محل ہوٹل کی مٹھائیاں، خونڈانٹ وغیرہ۔ ہ بایک خوان بھیجوں۔ مگر ان کی عمر ایک دو دن کی زندگی ہوتی ہے چلا جاتا ہے

... فرامرز کی اصلی تمنا میں ان تمام باتوں سے سمجھ رہا تھا۔ اس کا بالزم، مجھے اسقدر سمجھنا۔ یک شادی کے تحفہ کے لئے اس قدر تفصیلات بیان کرنا، ان باتوں میں جو وہ بیان کر رہا تھا، وہ مطالب جو وہ بیان نہیں کر رہا صاف جھلک رہے تھے۔

کہنے لگا: "آخر کار انتخاب کر ہی لیا۔ آؤ دکھاؤں۔ یہ کہتا ہوا مجھے کوسیٹ کرا کس اینڈ کمپنی جوہریوں کے ہاں لے گیا۔ وہاں ایک کمرے میں بیٹھا کر بیچنے والے سے پوچھنے لگا: سنگاردان تیار ہوگیا؟

سنگاردان تیار ہو چکا تھا۔ وہ لایا گیا۔ یہ چاندی کا، (جس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا) ایک چھوٹا سنگاردان تھا، جو ایسی نزاکت و نفاست سے بنایا گیا تھا، کہ بنانے والے نے اپنی حسن طبیعت کو ایک ایک خط میں صرف کیا تھا۔ ڈھکنے پر چاندی کے مجسم پھول اور پھل۔ مثلاً سیب اور نارنگی کے پھل اور گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے، ان میں جا بجا موتی ٹکے ہوئے تھے۔ اندر کے خانے، پوڈر اور عطروں کی شیشیوں، اور قیمتی صابونوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر ایک چاندی کی کشتی تھی جس میں مخمل بچھی ہوئی تھی۔

کہنے لگا: میں نے اس کو بنوایا۔ اس میں عطر ہونگے۔ عطر میں بسے ہوئے رومال ہونگے سنگار کی چیزیں ہونگی، خوشبوئیں ہونگی۔ اُبٹن ہونگے پوڈر ہونگے

وہ چیزیں ہوں گی جو اسکے مشام خیال میں برسوں تک کسی وقت بہار زندگی کی خوشبوئیں پہونچا ئینگی ......

غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں بھول گیا تھا، اور مجھے اپنا راز دار سمجھکے باتیں کر رہا تھا۔ یہانتک مجھے یہ سمجھانے لگا کہ اس تحفہ کو کیوں انتخاب کیا۔ وہ باتیں جو اس کے قلب میں بھری پڑی تھیں کسی کو سنا کے خالی کرنا چاہتا تھا۔ شاید اُس دن میں نہ ہوتا اُسے کوئی دوسرا ملتا، اُسی سے یہ سب باتیں کہتا:

"سمجھتے ہو؟ اس تحفے کے مطلب، اس ہدیہ کے مانند۔ اس کی روح کو پورے طور پر محسوس کرتے ہو؟ اس طرح میں اسکے کپڑوں تک میں حلول کر جاؤں گا۔ یہ چیزیں اُن کے ایک ایک بال بال پہونچا ئیں گی، اُس کے خواب نوشین میں بھی میری کوئی نہ کوئی چیز ہوگی۔ میں اُس کے نہانے کے پانی تک میں نفوذ کر جاؤنگا، یعنی ملکہ جب اپنی ہتھیلیوں میں چلو بھر بھر کے پانی لے گی، تو اُس کی پتلی انگلیوں کے بیچ میں سے آبشار مسرت بن بن کے، اُسے ایک لطیف اور معطر ٹھنڈک کی بہار دونگا۔ اور جب وہ نہا کے تولیہ سے بدن پونچھیگی تو اُس کے مونہہ، اُس کی گردن اُس کے کندھوں سے، گویا میری روح کا ایک نفس خیال ایک غبار صاف و سفید بنکر، ایک معطر بوسہ پرّان کی طرح اُترے گا۔ اُس کے بعد اپنے رومال کو وہ لونڈر کے دو قطروں سے ملیگی، اور جب وہ اُسے سونگھیگی تو گویا میں اُس کی تمام اعماق روح میں پہونچ جاؤنگا ......"

یہانتک پہونچ کے اس نے یکایک معلوم کیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گیا اور وہاں تک بڑھ گیا کہ اب واپس ہونا ممکن نہیں، یہ دیکھکے اُس نے

میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے، اور اپنے تمام اضطراب قلب کو ایک چھوٹی سی آہ میں قید کر کے کہنے لگا: "آہ! اس قصہ کو میں تمہیں کسی اور دن سناؤنگا"۔

غرضیکہ فرامرز نے مجھسے اپنے فسانۂ دل کا کہنا اس طرح شروع کیا تھا: اول اول ہماری ملاقات محض ادبیات کے جلسے ہوا کرتے تھے، وہ بھی فارسی ادبیات کا عاشق، فنسٹن کالج سے فارسی میں آنرز کا گریجوایٹ میں فارسی ادبیات کا دلدادہ، وہ قاآنی کے قصیدے اور پروفیسر مرزا حیرت اور حافظ کی غزلیں سناتا، سناتا، فسانۂ دل سنانے لگا۔ اس دن کے بعد ہر ملاقات میں اس فسانۂ دل کے باب پڑھنے لگے، یہانتک کہ میں اس کی تمام سرگذشت حیات سے واقف ہوگیا۔ گویا اس کی عاشقانہ زندگی ایسی زندگی تھی کہ میں بھی اسمیں شریک تھا، اور ہم دونوں ملکے اس زندگی کو بسر کر رہے تھے۔ اسوقت میں نے یہ قطعی رائے اپنے دل میں قائم رکھی تھی کہ وہ فرامرز کا یہ عشق، اول اور آخری عشق ہوگا۔ لیکن وہ اسے قبول نہ کرنا چاہتا تھا، اگر اس کے ادعا پر اعتبار کیا جاتا تو یہ عشق محض ایک بچپن تھا، ایک لڑکپن کا کھیل کہ معلوم نہیں کب سے شروع ہوا، مگر شروع ہوکے جاری رہا۔ اس کے متعلق جو اپنی باتیں یاد تھیں ہنس ہنس کے اگویا نہیں اہمیت دینی چاہتا) بیان کرتا اور بیان کرتے وقت اس لڑکپن پر تعجب کرتا نظر آتا تھا، لیکن نہ معلوم کیوں، ایک تہ شیر عمیق، اس ہنسی اس خندۂ استہزا کے پردے کو چیر کے، نوجوان آدمی کے دل میں ایک غیر قابل شفا زخم کو ظاہر کرتی تھی جو اس عشق سے پڑ گیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ عشق کیا تھا، مذاق تھا، وہ کہتا: "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس تمام دورۂ عشق میں

بیاہ کرنا، یا سادہ عشق و محبت کی حد سے آگے بڑھنا، یا بڑھنے کی جرأت کرنا، ہم دونوں کے خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ ہم بس سادہ ایک دوسرے کو چاہنا، یا یہ خیال کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے عاشق ہیں گویا ہم دونوں نے ایک وقت مقررہ کے لئے حسن و عشق کا ایک مضحک ناٹک کھیلنے کا ارادہ کیا تھا، اور ہم دونوں ایکٹر تھے۔ پردہ گرتا، تماشہ ختم ہوتا، اور ہم دونوں ایک دوسرے سے نہایت خوشی سے ہاتھ ملاتے، اور ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے کہ خوب پارٹ کیا، اور اس تماشے کو جسے ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا، وہیں چھوڑ کے، ہر اک اس راستے پر پڑلیتا جو ہمارا طابع معیشت ہمارے لئے ہمیں بتاتا۔ ہم دونوں اسے جانتے تھے، اور اس کے متعلق گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اپنی شادی کے متعلق اپنے تصورات مجھسے بیان کیا کرتا، جن گھرانوں سے اس کے لئے پیغام آتے ان کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتا،۔ یہانتک کہ ایک دن ماں بیٹی کا ایک جوڑا اس کے گھر آنے والا تھا، اور یہ معلوم تھا کہ دونوں ماں بیٹی، اُسے انتخاب کرنے کی نیت سے آ رہی ہیں، اُسدن، میں نے ہی اُسے بتایا کہ کیا کپڑے پہننا چاہئیں اور کیا سنگار کرنا چاہیئے۔ ازدواج، حقیقتِ زندگی سے اس قدر متعلق ایک چیز تھی کہ اُس کا سوچنا بھی ممکن نہ تھا، میں تو اُس مناسبت (یا اگر آپ اُسے اس لفظ سے یاد کرنا چاہیں تو) اس عشق کے جہتِ شعری کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کو ایک خواب ابدی محبت میں رکھکے، اپنی زندگی بھی اسی مدہوشی میں گذارنا چاہتا تھا۔ بس اس قدر اور کچھ نہیں ...! پھر گویا ان تمام حجتوں کی تائید کے لئے اس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم،

اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ رچا ہوئی تھی جو مجھ سے بھی ایک صدقۂ تصدیق مانگتی نظر آتی تھی کہ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کٹھ حجتوں سے خود اُسکا دل بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اگر میں ایک لفظ بھی ایسا کہہ دیتا جس سے شبہ ہوتا کہ میں ان حجتوں پر یقین نہیں کرتا، یا ذرا سا بھی خیال ایسا ظاہر کرتا کہ میں اُس کی غفلت حسیات سے جنہیں وہ کوشش کر کے بڑھانا چاہتا تھا، ہٹانا چاہتا ہوں، تو میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ ایک دم سارا اعتراف کر لیتا، رو پڑتا اور کہتا کہ میں اُس کے عشق میں مر رہا ہوں۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو حقیقت میں گویا میں اُس کی موت لاتا۔ وہ اپنے دل کو دھوکا دینا چاہتا تھا، اور مجھے بھی لازم تھا کہ میں اس معاملہ میں اس کی تائید کروں، ورنہ اُس کے دل پر حقیقت ظاہر کرنے کی چوٹ لگاتا یعنی یہ کہتا کہ درا صل تم اُسے از جان و دل چاہتے ہو۔ گناہ تھا۔ مجھے یہی لازم تھا کہ میں اُس کی اس کوشش میں کہ وہ اپنے زخم دل کو ڈھانپتا، اور اُس سے نگاہ ہٹانا چاہتا تھا، اس کی مدد کروں اور اس طرح اُس کی سلامتی کی خدمت کروں۔

لیکن کبھی کبھی وہ مجھسے کھل جاتا، اور ایک دوسرے لہجہ میں کہتا: "کہیں تمہیں خبر ہو کہ ان تمام حرکتوں سے جو لڑکپن سے زیادہ کچھ نہیں کبھی کبھی مجھ میں اک عجیب تاثیر حسرت پیدا ہوتی ہے۔ ہاں میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ایک ایسی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ میں رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ جبکہ یہ لڑکپن، ہنسی کھیل سے آگے کے درجہ کی کوئی چیز نہیں، جب کہ اگر اس پر غور کیا جائے، تو اس کی قیمت ایک قہقہہ سے زیادہ نہیں، جب یہ حالت ہے تو یہ حسرت کیوں؟....

سوچا تو خود ہی اس کی حقیقت مجھ پر ظاہر ہوئی: ہمارا یہ کھیل ہمیشہ رہنا چاہیئے تھا، اُسے تا ابد ایک لڑکی رہنا چاہیئے تھا، اور مجھے تا ابد نوجوان لڑکا رہنا چاہیئے تھا۔ یہ حالت، بڑھنے والی، کبھی نہ گھٹنے والے برسوں کی لا متناہی مدت کے ساتھ قایم رہنا، جاری رہنا چاہیئے تھی۔ یہ خواب بغیر اس کے کہ حقیقت کا ضربہ اسیر لگے، یہ افق گریزاں بغیر اس کے کہ حد پر پہونچے، یوں ہی دراز ہوتے رہنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ ضرور ایک نہ ایک وقت آتا کہ ضربہ حقیقت اس شگوفہ خیال پر پڑ کر اسے بکھیر دیتا۔ آخر وہ وقت آیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے ہم کیا کر سکتے تھے؟ بیاہ؟ اس کا نتیجہ عینی ہی نہ تھا؟ کیونکہ بیاہ کے بعد یہ خواب بالکل ملیامیٹ نہ ہو جاتا؟ مگر نہیں ملیامیٹ نہیں ہوا۔ ہمیں اس زندگی کے شعر کو یاد رکھنا مقصود تھا، سو وہ شعر اب بھی شعر بکر و تازہ ہے اُسکی یاد زندہ رہیگی اور زندہ ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کا خیال کر کے، مگر زیادہ لاہوتی، زیادہ روحانی مناسبت کے ساتھ (یہانتک کہ اب اس کے متعلق باتیں بھی نہیں ہوتیں) زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گویا دور سے، یاد ایام کے ساتھ ایک خاموش عاشقی معشوقی لیکن ....» لیکن کے بعد فقرے کو پورا نہیں کرتا، پھر اس تقریر کو جسے میں کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا ایک لمبے اور ٹھنڈے سانس سے جس میں بڑی کوشش سے وہ ایک قہقہہ بھی شامل کر سکا، ختم کر کے کہنے لگا: «کیا معلوم تم میری ان بہکی باتوں پر دل میں کس قدر ہنستے ہوگے، اور میری حقارت کرتے ہوگے؛ اور ابھی سچ پوچھو تو ساری اصل و حقیقت، سارا لطف شعر یہاں ہے،» یہ کہکے اپنے چہرے پر شوخی اور شرارت کا رنگ لاکے، مثلاً سامنے

جو پائیں باغ سمندر کے کنارے بیچ پر کوئی حسین یار سن بیٹھی ہوتی تو اسکی ریشمی ساڑھی کو سمندر کی ہوا ہٹا کے۔ اس کی گوری گردن، اور ہلکے کپڑے میں چھپے ہوئے سینے کی جھلک دکھاتی کن انکھیوں سے اس کی طرف اشارہ کرتا۔

میں اپنے دل میں کہتا: "بدقسمت بیمار، غیر قابل شفا بیماری میں بیمار"، لیکن کچھ دنوں بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُسے اپنی بیماری کا علاج مل گیا تھا۔ اب ایک نشوۂ بے قید کے ساتھ، اُن لوگوں کی طرح جو زندگی میں مزہ ہی مزا کرنا چاہتے ہیں، اُس نے اپنے تئیں اندھا دھند عیش میں ڈال دیا۔ ایک جاڑے کا موسم متواتر گرانٹ روڈ کے تھیٹروں ہی میں گذارا۔ مجھ سے کہتا: "دن سو سو کے گذارنا بھی کیا مزے کی چیز ہے۔ انسان چونکہ سورج کو نہیں دیکھتا، اس لئے اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ رات کی زندگی گویا کرۂ ماہتاب میں جاکر زندگی بسر کرنیکی معلوم ہوتی ہے۔ جا ہو تجربہ کرکے دیکھ لو۔" باقی دارد

(سجاد حیدر)

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ جبر دل پر ہے اختیار کے ساتھ
اب کہاں وہ نمود گلشن کی پھول رخصت ہوئے بہار کیساتھ
وہ یہاں آئیں یہ نصیب کہاں لگ گئی یاس انتظار کے ساتھ
ہائے بیچینیاں مرے دل کی درد بھی تو نہیں قرار کیساتھ
دل سے ہے نوک جھونک مژگاں کی کیسا کانٹا پڑا ہے خار کے ساتھ
نرگس نیم مست نے مارا بھر گیا جام اک خمار کے ساتھ
زندگی زندگی نہیں آزاد لاکھوں دکھڑے ہیں جان زار کیساتھ

ہماری قوّت بیانیہ کا زوال

اس میں تو شاید ہی کسی کو کلام ہوگا کہ ہماری قوت بیان میں اب وہ رنگینی اور رنگ آمیزی نہیں رہی جو پہلے تھی یا جو فارسی زبان کی خصوصیت ہوگئی ہے۔ کسی فارسی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے زور بیان کا جلوہ اوّل سے آخر تک نظر آئیگا۔ جہاں جنگ کا تذکرہ آیا ہے وہاں صفحوں کے صفحے مردانہ اشعار سے مزین ہیں۔ اگر حسن وعشق کا ذکر چھڑ گیا تو اسی پر زور انشا صرف کیا گیا ہے۔ اور صفت وثنا تو گویا انپر ختم تھی۔ ایک باغیچہ کی تعریف میں دو کتاب کی کتاب دلچسپی سے لبریز اور نادر جذبات سے معمور لکھ سکتے تھے۔ آج وہ زور بیان کہیں نہیں نظر آتا۔ خیر فارسی تو رہی نہیں مگر فارسی کی جانشین اُردو میں بھی وہ بات نہیں ملتی۔ ابتدا میں بیشک اس نے بھی وہی رنگ اختیار کیا تھا۔ مگر چونکہ ابتدائی مشق تھی اس لئے بہت اچھی نہیں تھی۔ اگر مشق جاری رہتی تو شاید وہی خوبیاں پختہ ہو جاتیں۔ مگر مشق جاری کیونکر رہتی۔ زمانہ نے رنگ بدلا۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان نے بھی اپنا رنگ بدل ڈالا۔ اب ہم سلاست اور اختصار کے دلدادہ ہیں۔ ہماری کتابیں خواہ وہ مبتدیوں کے لئے لکھی جائیں۔ خواہ منتہیوں کے لئے سلیس ہونی چاہئیں۔ اور اس میں رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں۔ اوّل تو رنگ آمیزی کے مسالے ہی نہیں باقی رہے۔ اور اگر مانگے تانگے کے خیالات سے تھوڑی بہت رنگینی پیدا بھی کیجاسکتی تھی

وہ ان قیود کی وجہ سے رُک گئی - آج ناول اور تاریخ اور تذکرے اکثر شایع ہوتے رہتے ہیں مگر اُن کے واقعات کی تحقیق - اور سلاست زبان کی جا ہے جتنی تعریف کیجئے انشا پردازی کے لحاظ سے وہ سب کی سب قریباً صفر کے برابر ہیں چنانچہ ہماری زبان کا روزمرہ تو صاف ہوتا جاتا ہے اور اس کے علمی پہلو کی بھی تھوڑی بہت ترقی ہو رہی ہے مگر ادبی پہلو روز بروز زوال پذیر ہے +

اس قوت بیان کے زوال کا سب سے بڑا اور مہلک سبب پہلا افلاس ہے - پرانے زمانہ کے مصنفین شاہی درباروں اور امیرانہ شان وشکوہ کے جلوے دیکھتے تھے - بلکہ اکثر اوقات بادشاہوں اور امیروں کے دربار میں بالانشینی کا رتبہ رکھتے تھے - شیشہ و آلات نادرہ ہیرے و جواہرات ظروف بیش بہا - جلوس شاہانہ - فوجوں کا طمطراق اور تزک و احتشام - اور خدا جانے کتنی ہی اور باتیں جو ان کی نظروں کے سامنے روزمرہ گذرا کرتی تھیں اُن کا آج ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے - آج کے مصنفین میں ایسے بہت کم ہونگے جنھوں نے ہیرے جواہرات کی صورت دیکھی ہو - خدا جانے مغرق عماریاں کیسی ہوتی تھیں - ظروف بیش بہا کاہیکو کسی نے دیکھے ہونگے - اور فوجی شوکت اور دلیرانہ جانبازیاں تو گویا ہمارے لئے افسانے ہوگئے - یہی سب قوت بیانیہ کو اُٹھانے والے اسباب تھے - جب مصنف کو نت نئے جلوے نظر آتے تھے تو زبان میں خود بخود روانی پیدا ہوتی تھی - اور خیالات نکل آتے تھے - اب تو یہ حال ہے کہ ہم تاریخوں یا قصہ کہانیوں میں بادشاہوں کا ذکر ہی نہیں کرتے - یا اگر ذکر کیا تو بس اتنا کہ وہ ایسا

مالدار تھا اور اتنی فوج رکھتا تھا۔ بس اس سے آگے قدم رکھنے کی ہم کو ہمت ہی نہیں ہوتی۔ شاید کسی اُردو ناول میں آجتک کسی مصنف نے شاہی دربار کا نقشہ نہیں کھینچا۔ اور نہ کسی بادشاہ یا ملکہ کو ہیروئن بنایا۔ جب ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ بادشاہوں کے لئے عیش و عشرت اور کر و فر کے کیا کیا لوازمات ہیں تب تک ہم اسے ہیرو کیونکر بنا سکتے ہیں۔ یا اگر کسی نے ایسا کیا تو اُس کے بادشاہ ہیرو اور سوداگر ہیرو میں کوئی نمایاں فرق نہ نظر آئیگا۔ اسی سے ہمارے ناولوں کی ہیروئنیں اور ہیرو سیدھے سادے عمولی اوقات کے لوگ ہوتے ہیں۔ تاکہ اُنکی زندگی کا مرقعہ کھینچنے میں ہمیں ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ اردو ہی میں پہلے فن موسیقی۔ فن شکار و بازیگری۔ فن شہسواری وغیرہ کی صدہا اصطلاحیں ہر خاص و عام کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اب ان فنون کے زوال کے ساتھ ساتھ وہ اصطلاحیں بھی فراموش ہوتی جاتی ہیں۔ کچھ دنوں میں ہم بجز کتابی زبان کے اور کسی زبان سے اُنہیں نہ سن سکیں گے۔ قومی افلاس کا اثر جسقدر زبان پر پڑتا ہے اتنا شاید اور کسی چیز پر نہیں پڑ سکتا +

(۲)۔ دوسرا سبب اس زوال کا۔ جسے ہم شاید افلاس ہی سے منسوب کر سکیں ہماری بدشوقی ہے۔ ہم میں اب بھی بفضل خدا ایسے بہت سے لوگ ہیں جو فراغت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جنہیں سیر و تفریح کے بہت سے موقعے حاصل ہیں۔ مگر ہم کچھ ایسے آرام طلب اور اپاہج ہو گئے ہیں۔ ہم میں زندہ دلی اس قدر مفقود ہو گئی ہے۔ اور ہمارے دلوں پر کچھ ایسی اوس پڑ گئی ہے کہ کسی کام سے جسمیں غور و خوض اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے ہم جی چراتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں

جنہوں نے تاج محل اور فتحپور سیکری کی عمارتیں دیکھی ہونگی۔ لیکن اگر ان سے ان عمارتوں کے ایک ایک جزو کا نام پوچھا جائے تو وہ شاید مشکل سے بتلا سکیں۔ فن معماری کے متعلق بیشمار اصطلاحیں تھیں۔ اب ایک بھی نہیں سننے میں آتی ۔۔ ہندوستان میں انواع و اقسام کے خوشرنگ طیور نظر آتے ہیں۔ افلاس نے ہماری آنکھیں تو نہیں بند کر دیں۔ مگر ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو ایک درجن سے زاید قسموں کے نام بتلا سکیں۔ شاید ہم میں پچھتر بلکہ نوے فیصدی لوگ ایسے ہونگے جو قمری کو نہیں پہچان سکتے۔ بس طوطا۔ مینا۔ کوا۔ چیل یہی دس پانچ نام ہم کو یاد ہیں۔ زیادہ نہیں۔ باغیچے اب بھی اکثر بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ انمیں رنگین مزاج لوگ تفنن طبع کیلئے جاتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کتنے آدمی ایسے ہیں جو ایک درجن سے زاید پھولوں کا نام بتا سکیں۔ انکے خواص وغیرہ کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ہمارے ہی ملک کے پھولوں کے پودوں پر آج باغیچوں میں انگریزی نام کے ٹکٹ چسپاں کئے جاتے ہیں۔۔ اور ہمیں ان کے انگریزی نام تو معلوم ہیں۔ مگر اردو یا ہندی نہیں۔ جب ہماری طبعیتیں ایسی مردہ و افسردہ ہو گئی ہیں تو بیان کو کیسے فروغ ہو۔ اور وہ رنگ آمیزی کرنے کے لئے کہاں سے مسالے لائے۔ جب آپ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ ہی نہ کرینگے۔ جب آپ قدرت کی خوبیاں ہی نہ دیکھیں گے۔ جب آپ آنکھیں بند کئے روٹی کے دھندوں میں لگے رہینگے تو آپ کہاں سے تشبیہات و استعارے لائیں گے۔ کیونکر قلم کی جودت دکھائیں گے۔ اور کیونکر انشا پردازی اور حسن بیان کے کمال تک پہونچ سکیں گے ۔۔ اب تو ہم سے پرانے نقمے بھی نہیں چبائے جاتے۔ نہ ہم انہیں ہضم ہی کر سکتے ہیں۔ اور نہ ان میں ہم کو مزہ ہی آتا

انانیت اور مردہ دلی دو بلائیں تو تھیں ہی۔ اس پر مزید یہ کہ سستی شہرت پیدا کرنے کی ہوس ہر شخص کو دامنگیر ہے جس نے دو چار کتابیں اردو کی پڑھ لیں وہ لکھاڑ اور نثار بن بیٹھا۔ پہلا مضمون قلم سے نکلا۔ اور اس کے چھپوانے کی کوشش ہونے لگی۔ بھلا کچھ نہیں تو ہزار دو ہزار نسخے تو رنگ سے لئے جائیں قبل اس کے کہ کسی مضمون یا تصنیف کو شایع کرانے کا خیال پیدا ہو۔ چونکہ ہمارے مضامین کسی باقاعدہ مطالعہ یا ریاضت کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے ہم کسی ایک شق ادب پر قایم بھی نہیں رہ سکتے۔ جو کچھ خیال میں آیا ٹیڑھا سیدھا لکھ دیا۔ آج کوئی قصہ لکھ دیا۔ کل کسی قرب و جوار کے شہر کا تذکرہ۔ پرسوں ایک تاریخی واقعہ کا ترجمہ۔ بعد ازاں کسی اور طرف جھک گئے۔ اس میں شک نہیں ہر رنگ میں چمکنے کی کوشش کرنا بہت قابل تعریف بات ہے اور ایک ہی رنگ میں محدود ہو جانے سے ہمارا قلم من مانے طرارے نہیں بھر سکتا۔ مگر ایسے دماغ جو ہر رنگ میں چمک سکیں۔ ایسی طبیعتیں جو نظم و نثر کے ہر رنگ پر قادر ہوں ایسا ذہن جو ہمہ گیر ہو شاذ کسی کو ملتا ہے۔ اگر ہم ایک صیغہ ادب کو لے لیں اور پڑھنے کے لئے جو چاہیں پڑھیں۔ مگر لکھیں اُسی ایک صیغہ کے متعلق تو ہماری زبان کو بہت فائدہ پہونچے۔ اگر ہمارا رجحان تاریخ نگاری کی جانب ہے تو ہم اسی شق ادب کو اپنا حصہ بنالیں۔ کوئی فلسفہ کی طرف مخاطب ہو۔ اور اسی شق ادب میں چمکنے کی کوشش کرے۔ کچھ لوگ زراعت و فلاحت پر مضامین لکھیں۔ غرض اپنے قلم کو کسی ایک میدان تک دوڑائیں تب ہم اُس ایک صنعت کے کُل الفاظ اور اصطلاحوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ اور قوت بیانیہ کے نشو و نما میں اس سے بہت زیادہ مدد ملیگی۔ علاوہ ازیں جوں جوں پرچے اور رسالے بڑھتے جا رہے ہیں ہم میں زود نویسی کی عادت

پڑتی جاتی ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ جو کچھ لکھتے تھے اُسے پہلے دس پانچ بار خود کاٹ چھانٹ کر اپنے دوستوں کو دکھاتے تھے۔ اب آجکل نثر کا دور ہے ایک بار لکھ کر اُسے دہرانا مذموم سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اصل مسودہ کو دوبارہ صاف کرنے کی محنت بھی نہیں برداشت کی جا سکتی۔ ایسی حالت میں زور بیان یا کمالات انشا پردازی کا دکھانا غیر ممکن ہی نہیں بعید از قیاس ہے۔ اور اس تیز نگاری کی شکایت کچھ اسی ملک میں نہیں ہے۔ انگلستان وغیرہ ممالک میں بھی لٹریچر کے ادبی پہلو کے زوال کی شکایت سننے میں آتی ہے۔ جو رنگینی اور لطف زبان اور زور بیان اٹھارہویں صدی کے مصنفین میں موجود ہے وہ گذشتہ یا موجودہ صدی کے مصنفین میں نہیں ملتی۔ مگر ہاں اس کمی کے ساتھ ساتھ سائنس صنعت و حرفت اور فلسفہ میں اُنہوں نے جس مدت میں جو ترقیاں کی ہیں وہ اس کمی کی تلافی کر دیتی ہیں ہمارے ہاں ان اصناف کا تو کہیں ذکر نہیں۔ جو کچھ بساط ہے وہ ادبی مضامین اور کتابوں تک محدود۔ اور ان کا بھی یہ حال! نظم ہو یا نثر۔ زور بیان اُس کی جان ہے جب یہی نہ ہوا تو وہ نظم یا نثر روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ اس زوال کے لئے ہمارے طرز تمدن کا انقلاب بھی ایک حد تک جواب دہ ہے۔ اب نہ پرانے مراسم اداب رہے نہ وہ عیش و عشرت کے سامان۔ اور نہ امرا و رؤسا میں وہ شوق۔ بجائے چوگان بازی کے اب کرکٹ اور پولو کا زور شور ہے بجائے رنگین جلسوں کے اب گارڈن پارٹیاں ہیں معاشرت میں جو ایک دلپذیر تکلف تھا اُس کی جگہ اب تکلیف دہ تصنع ہے۔ ان باتوں کی تفصیل کے لئے نہ ہماری زبان میں الفاظ ہیں اور نہ اصطلاحیں۔ اگر ہم کسی رئیس کے کمرہ کی آرائش کا بیان کرنا چاہیں تو

ہمارے امکان سے باہر ہے۔ اُس کا تین چوتھائی سامان بالکل انگریزی ہی جسکو ئے ہماری لغت میں الفاظ ہی نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ روزمرہ بیان دکھانے میں کسیقدر تکلف پیدا ہوجاتا ہے۔ مگر اسے قابل معافی سمجھنا چاہئے کیونکہ فن ادب کیلئے تکلف مگر تصنع نہیں ایک چاشنی ایک ضروری شے ہے + (نواب رائے)

زنانہ حسن ولباس ۔ اس نام کی ایک کتاب مسٹر مدن گوپال صاحب ایم۔ اے۔ پلیڈر ساکن لاہور نے شایع کی ہے۔ اردو زبان کا علم ادب ابھی بہت محدود ہے۔ اور اس لحاظ سے جو کتاب کسی نئے مضمون پر تحریر کی جاوے اس امر کی مستحق ہے کہ اسکی کافی قدر کیجائے تاکہ مصنف کی حوصلہ افزائی ہو۔ علم حسن پر انگریزی اور دیگر السنہ مغربی میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں لیکن السنہ مشرقی اس شریف علم سے تقریباً بالکل معرا ہیں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مغربی اقوام مثل اہل یونان اہل روما۔ اہل اٹالیہ وغیرہ نے سنگتراشی و مصوری کی جانب مشرقی اقوام سے زیادہ توجہ کی ہے خصوصاً انسان کی تصویر و بت بنانے میں تو وہ مشرقی اقوام سے گوے سبقت لیگئی ہیں۔ اسکا لازمی نتیجہ ہے کہ جسم انسانی کی ساخت اور اسکے محاسن و معائب کے مشاہدہ کا شوق پیدا ہوا اور علم حسن کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے بہر حال مسٹر مدن گوپال نے اردو علم ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے اور ہم ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرے۔ مصنف کی بعض رائیں کسی قدر انوکھی ہیں اور جو اکثر لوگوں کو ناگوار گذریں گی۔ مگر اس سے کتاب کی دلچسپی میں فرق نہیں آتا۔ یہ کتاب بظاہر مستورات کے فائدہ کیلئے لکھی گئی ہے۔ مگر ہمیں افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مصنف نے مستورات کے مخاطب کرتے ہوئے تحریر کے ان اصولوں کو مد نظر نہیں رکھا جن کی تلقین مشرقی تہذیب و مغربی تہذیب دونوں کرتی ہیں صاف الفاظ میں ہمارا یہ مطلب ہے کہ مصنف نے بعض مقامات پر بیباکانہ گوئی سے کام لیا ہے اور اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا کہ صحیح مستورات سے خطاب کرتے ہیں۔ اگر بہت سی باتوں کا تذکرہ خلاف تہذیب خیال کیا جاتا ہے۔ بعض اس قسم کا ہے۔ یہی وجہ ہے ہمیں امید نہیں کہ یہ کتاب شمالی ہند کے معزز و باوضع گھرانوں میں کچھ زیادہ رواج پائے +

اس کتاب کی ظاہری خوبیاں بہت سی ہیں منجملہ انکے ایک یہ ہے کہ مختلف ممالک کے زنانہ حسن و لباس کی عکسی تصاویر چسپاں کیگئی ہیں۔ کتاب مجلد ہے قیمت قسم اول للعہ قسم دوم عہ مصنف سے مل سکتی ہے

مالوہ کی سیر

برہان پور

بھوپال - اُجین - اندور - دہار - اور مانڈو کی سیر سے فارغ ہو کر ہم صوبہ خاندیس کی پرانی دارالسلطنت برہان پور میں پہونچے یہ اب ممالک متوسط کا ایک آباد قصبہ ریلوے سٹیشن سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس شہر نے بہت سے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں سنہ ۸۰۲ھ ۱۴۰۰ء میں نصیر خاں فاروقی نے جو خاندان فاروقیہ خاندیس کا پہلا خود مختار بادشاہ تھا اس کی بنیاد ڈالی تھی - نصیر خاں مذکور کا باپ ملک راجہ حضرت مخدوم زین الدین اولیا دولت آبادی کا مرید اور خلیفہ تھا - جب نصیر خاں نے قلعہ آسیر کو فتح کیا تو شیخ زین الدین رح دولت آباد سے مبارکباد کے واسطے خاندیس تشریف لائے نصیر خاں مخدوم کے استقبال کے واسطے آگے بڑھا دریائے تاپتی کے کنارہ اس مقام پر جہاں اب زین آباد آباد ہے ملاقات ہوئی - نصیر خاں نے شیخ سے آسیر تشریف لے چلنے کے واسطے التماس کی - آپ نے فرمایا مجھے دریا سے عبور کرنے کا حکم نہیں ہے - نصیر خاں شیخ سے اجازت لیکر پلٹ آیا اور دریا کے دوسرے کنارہ پر جہاں اب برہان پور آباد ہے خیمہ اور خرگاہ لگا کر فروکش ہوا ہر روز پانچ مرتبہ شیخ کی ملازمت میں حاضر ہو کر فیض صحبت سے فیضیاب ہوتا تھا جب دو ہفتہ بعد شیخ نے دولت آباد کی واپسی کا قصد کیا نصیر خاں نے عرض کیا کہ اگر آپ فلاں قصبہ اور پرگنہ کو لینا فرمائیں تو نہایت سرفرازی ہوگی - شیخ نے باوجود بے حد اصرار کے

یہ امر قبول نہ فرمایا اور کہا کہ درویشوں کو قصبہ - پرگنہ - وظیفہ سے کیا نسبت ہے - جب نصیر خاں نے بہت اصرار کیا تو شیخ نے فرمایا کہ دریا کے اس پار کہ سلاطین اور غازیان اسلام کے نزول کا مقام ہے ایک شہر آباد کرکے میرے پیر شیخ برہان الدین غریب کے نام پر موسوم کرو اور اُسے اپنا دارالسلطنت مقرر کرو اور دریا کے اس پار جہاں فقیر وارد ہے ایک قصبہ اور مسجد تعمیر کرکے اُس کا زین آباد نام رکھو اس تقریب سے اسلام اِن دونوں قطعات میں رواج پائے اور اس درویش کا نام بھی باقی رہے - نصیر خاں فاروقی شیخ کے اس ارشاد سے بہت خوش ہوا اور اسی وقت دونوں مقام کی آبادی کا حکم دیا شیخ نے فاتحہ مبارکباد پڑھکر دولت آباد کی طرف واپسی فرمائی - عرصہ قلیل میں شہر اور قصبہ نہایت معموری اور آبادی کے ساتھ اختتام کو پہونچا اور برہان پور دوسو برس سے زائد یعنی سنہ ۱۰۰۸ھ تک سلاطین فاروقیہ کا دارالسلطنت رہا - اس کے بعد اکبر کے قبضہ میں آیا اور سلاطین مغلیہ کے عہد میں شاہجہاں کے زمانہ تک کل صوبہ خاندیس اور دکن کا صدر مقام اور بہت بڑا فوجی ہیڈ کوارٹر رہا - سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں نواب آصف جاہ اول (میر قمر الدین) کا قبضہ ہوا اور اُنہوں نے سنہ ۱۱۴۰ھ میں حصار شہر پناہ جو اب تک موجود ہے تعمیر کرائی - سنہ ۱۱۷۴ھ میں مرہٹوں کے قبضہ میں آیا - اب سنہ ۱۸۰۳ء سے سرکار کے قبضہ میں ہے - اس وقت یہ ضلع نماڑ کے متعلق ایک تحصیل کا صدر مقام ہے آبادی قریب تیس ہزار کے ہے سنہ ۱۶۱۴ء میں سر ٹامس رو کی جو انگلستان سے دربار مغلیہ میں سفیر بنکر آئے تھے اسی شہر میں شاہزادہ پرویز جہانگیر سے ملاقات ہوئی تھی

تھیونبر فرانسیسی سیاح نے ۱۶۴۱ء میں اسے دیکھا تھا - یہاں کے آثار قدیمہ میں سب سے مشہور کارخانۂ آبرسانی ہے جس کے ذریعہ سے تمام شہر میں کثرت سے مصفا پانی پہونچایا جاتا تھا گرد و نواح میں میں آٹھ رجباہوں اور آبادی کے اندر بہت سے پختہ نلوں کے جنکی ساخت میں اعلےٰ صنعت پائی جاتی ہے نشان اب تک موجود ہیں + آبادی سے ملے ہوئے قلعہ کے کھنڈر ہیں کہیں کہیں برج کا نشان اور چار دیواری باقی رہ گئی ہے قلعہ کے شمالی جانب دریا کے کنارہ پر عمارات شاہی تھے جن کے کچھ کھنڈرات ابھی موجود ہیں اور گذشتہ نقاشی اور رنگ آمیزی بھی کسیقدر باقی ہے دو تین پختہ حوض بھی نظر آتے ہیں - جنوب و مشرقی گوشہ میں ترکی وضع کا ایک حمام سنگمر کا کسیقدر اچھی حالت میں ہے جس میں اب ڈاک بنگلہ ہے اس کی چھتیں گنبددار ہشتمن ہیں درمیانی حوض اب بند کر دئے گئے ہیں مگر چھینے اور نالیاں وغیرہ موجود ہیں اس حمام کی کرسی دریا سے ۹۰ فیٹ بلند ہے جہاں سے دریائے تاپتی کا جو نیچے بہتی ہے بڑا دلکش نظارہ ہے - قلعہ کے اندر جو مسجد تھی اس کے صرف مینار باقی رہ گئے ہیں -

یہاں کی تمام مسجدیں علی العموم مینارہ دار ہیں اور سب میں حوض موجود ہیں اور چونکہ مسجد در مندر پانی کے ٹیکس سے بری ہیں اس وجہ سے ویران سے ویران مسجد میں بھی نل لگے ہیں اور پانی موجود رہتا ہے ... بی کی مسجد - تانا گوجری کی مسجد اور جامع مسجد کے مینار نہایت شاندار دور دور سے نظر آتے ہیں - جامع مسجد کی عمارت نہایت خوبصورت اور شاندار ہے یہ سنگ سیاہ کی مسجد ہے جس کا رقبہ ۸۴ فیٹ x

۱۵ ۳/۴ فیٹ ہے۔ اس میں پندرہ در اور چھیانوے ۹۶ ستون ہیں جو
اس ترتیب سے نصب ہیں کہ مسجد پانچ درجوں میں منقسم ہو گئی ہے یہ ستون
چوکور ہیں جن کا ہر ضلع ۱ فیٹ ۷ انچ ہے۔ محرابوں پر اچھا کام ہے چھت
لداؤکی ہے۔ ہر ستونوں کے درمیان ایک خاص اور جدید صنعت سے
بنائی گئی ہے جس سے مسجد کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی ہے۔ بیرونی محرابوں پر
کنگورہ اور چار منزلہ عالیشان میناروں پر سنہرے کلس جگمگاتے ہیں
صحن میں پختہ دو فرش ہیں پہلا فرش ۵۷ ½ فیٹ اور دوسرا ۲۹ ¼
فیٹ چوڑا ہے اس کے آگے دو حوض ہیں پھر دوسرا صحن اور اردگرد
حجرے بنے ہیں صدر دروازہ مشرقی جانب اور ایک ایک چھوٹا دروازہ
شمال و جنوب میں ہے۔ مسجد کے اندر درمیانی محراب پر محمد مصطفیٰ خطاط
کے ہاتھ کا لکھا ہوا عربی میں خوش خط خط نسخ میں کتبہ کندہ ہے جس
سے واضح ہے کہ اس مسجد کو سلطان عادل شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی
نے ۹۸۵ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اسی مضمون کا ایک کتبہ عربی اور ہندی
زبان میں شمالی محراب پر بھی کندہ ہے۔ جنوبی مینار کے نیچے میر معصوم
نامی کے ہاتھ کا کندہ کیا ہوا کتبہ ہے جس کے حروف مٹ گئے ہیں
اور صاف پڑھنے میں نہیں آتے اس میں شہنشاہ اکبر کے خاندیس
میں تشریف لانے اور قلعہ آسیر کو فتح کرنے اور رمضان ۱۰۰۹ھ میں
واپس جانے کا ذکر ہے +

برہان پور میں بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے بہت سے مزارات
اور درگاہیں ہیں جن پر عرس اور میلے ہوتے ہیں میں شاہ منصور رح
شاہ بہاء الدین رح۔ شیخ عیسیٰ رح۔ شاہ برہان الدین رازی اللہ۔ شاہ بل

اوّل دفن کی گئی تھی یہاں سے ۱۷ جمادی الاوّل سنہ ۱۰۴۱ھ کو منتقل کر کے آگرہ بھیجی گئی اِس باغ کے نشانات اب بھی موجود ہیں +

سعید احمد مارہروی

غزل

از تصنیف جناب لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی

عالمِ بالا کی سیریں شیشہ و ساغر میں ہیں
مستِ مے گویا کہ بزمِ ساقیٔ کوثر میں ہیں

یہ قیامت کی ادائیں آپ کی ٹھوکر میں ہیں
رہگزر کے رہنے والے عرصۂ محشر میں ہیں

گو بظاہر چمن سے بیٹھے ہوئے ہم گھر میں ہیں
گردشِ طالع سے گویا گھر میں بھی چکر میں ہیں

طفلِ گہوارہ نشیں کی طرح وہ بھی خیر سے
شوخیوں سے دست کش ہیں اور دلِ مضطر میں ہیں

وصل کی شب وہ چڑھانا تیوری کا ہجر میں
یوں کٹاتا ہے کہ لاکھوں سلوٹیں بستر میں ہیں

پاسباں گویا ہمارے شوق سے آگاہ ہے
یہ نہیں کہتا کبھی ظالم کہ بس ہم گھر میں ہیں

رشتۂ الفت کا پھندا پڑ گیا سلجھائے کون
جس سے ہم اُلجھے ہوئے اپنے ہی بال و پر میں ہیں

ہے قفس میں ہمکو آزادی کا رونا اے صفیر
غم نہیں ہے آب و دانہ کا کہ دونوں گھر میں ہیں

خونِ عاشق سے معاون سُرخیٔ رخسار کا
توڑ کر آئینہ وہ مُنہ دیکھتے خنجر میں ہیں

چشمِ بینا ہو تو حاجت طورِ سینا کی نہیں
اُسکے جلوے ہر در و دیوار و ہر منظر میں ہیں

قدرتِ حق جس نے دیکھی ہو نہ محدود آج تک
دیکھ لے اُنکو کہ وہ بیٹھے ہوئے منظر میں ہیں

آستاں پر اُنکے کی پیکر تراشی وہم نے
محوِ حیرت ہوں کہ کیا کیا صورتیں تیغِ ہمہ میں ہیں

خرقِ عادت شعبدے اعجاز جادو اور طلسم
دیکھنے سارے تماشے کو چۂ دلبر میں ہیں

تم تو اے مشتاق ہو ہر رنگ میں رنگے ہوئے
صوفی و صافی بڑے بھائی تمھارے گھر میں ہیں

احباب

آفرینش عالم کے بعد جب سے کہ بنی آدم کی تعداد بڑھنے لگی۔ قدرتاً یہی دستور چلا آتا ہے۔ کہ ہر ایک شخص کے ہزاروں آشنا اور واقف ہونگے۔ ہمیں مختلف جماعتوں۔ مختلف فرقوں۔ مختلف مذاہب کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ان میں سے چند اشخاص ایسے ہوتے ہیں۔ جنکے ساتھ ہمارا تعلق باقیوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ شخص ہیں جنکی صحبت سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جن سے ہم اپنے راز نہیں چھپاتے۔ جن سے ہمیں بوقت ضرورت امید امداد ہوتی ہے۔ جو ہماری خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں۔ اور یہی شخص ہیں جنہیں ہم دوست کہتے ہیں +

ہمارے باہمی تعلقات میں سے دوستی ایک بڑا بھاری رشتہ ہے کسی نے اسے ایک سنہری تار قرار دیا ہے۔ جو دلوں کو آپسمیں پیوستہ کرتا ہے۔ ٹیمپسن نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔ کہ "دوستی دو شخصوں کے درمیان ایک دوسرے کو فائدہ پہونچانے اور ایک دوسرے کی خوشی بڑھانے کی طرف دائمی میلان کا نام ہے" یہ ایک ایسا رشتہ ہے کہ ہماری زندگی پر ایام طفولیت سے لیکر اخیر عمر تک اس کا اثر ہوتا رہتا ہے۔ اسی سے ہماری ہوسیں بڑھتی یا فرو ہوتی ہیں۔ اسی کے سبب ہماری تکالیف بڑھتی گھٹتی ہیں۔ یہی ہمارے شکوک پیدا و رفع کراتی ہے۔ ہمارے دلوں کا بخل و کرم اسی پر منحصر ہے۔ اظہار و اخفائے خیالات اسی کے ماتحت ہے۔ غرضیکہ زندگی کے منازل کے راحت و رنج کا اکثر حصہ اسی پر منحصر ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ اس رشتے کو مناسب و مضبوط رکھنا ایک نہایت ہی ضروری فرض انسانی ہے +

دوستی کا ایک اعلےٰ نمونہ دنیا کے حقیقی مذاہب کے بانیوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پسندیدہ علاقہ میں ان کا طرز سلوک ایک آئینہ ہے۔ جس میں تمام حقیقی محبت کا عکس دیکھنا چاہیئے۔ اس کی قدر ان لوگوں کو معلوم ہے۔ جنہیں ان برگزیدگان خدا کی زندگی کے حالات سے کماحقہ واقفیت ہے وہ ہر ایک شخص کے جو اُن کے احکام کی تعمیل اور اُن کے طریق کی پیروی کرے دوست و معاون ہیں +

اس امر کی اہمیت کے ثبوت میں کہ اس رشتہ کے جوڑنے توڑنے میں نوجوانوں کو خاص توجہ چاہیئے۔ دو امر قابل غور ہیں:۔

(۱) اپنے بیگانے سب کے لئے ہمارا انتخاب احباب ہماری خصائل کا ایک صحیح معیار ہے۔ واقعی انسان کی قدر اس بات کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کہ اس کے اصحاب و ہمنشین کیسے ہیں۔ اگر ہمارے اصحاب اخلاق میں گرے ہوئے ہیں تو مشہور ضرب المثل "کند ہمجنس باہمجنس پرواز" لوگوں کو ضرور اس فیصلہ پر آمادہ کریگی۔ کہ ہم میں بھی کوئی اخلاق نہیں ہیں۔ اس فیصلہ کی صحت و راستی یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے۔ برعکس اس کے اگر ہماری صحبت خوش خلق معزز۔ ایماندار اور بااصول لوگوں سے ہے۔ تو خلق خدا ضرور ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھیگی۔ اور ہم پر اعتبار کریگی۔ اس لئے ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہماری نسبت عوام کی رائے نیک ہو تو دوست بنانے میں بڑے درجے کی احتیاط کو فرض سمجھیں اور اُس کی ادائگی میں تل بھر بھی کوتاہی نہ کریں +

(۲) ہمارے خصائل کے بنانے بگاڑنے میں جتنا اثر صحبت کا ہوتا ہے اور کسی تعلق کا نہیں ہوتا۔ کمینہ اشخاص کی صحبت میں بیٹھنا زندگی برباد کرنا ہے اور یہ کوشش کرنا کہ کسی سوسائٹی میں بیٹھکر بغیر اس سے متاثر ہوئیکے اس سے نکل آئیں۔ رائگاں ہے صحبت کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے لیکن یہ اثر زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ خواہ کسی کو محسوس نہ ہو۔ لیکن انسان کے نیک خیال و افعال کا خون کر دیتا ہے۔ ؎

اسپ و خر را گر بہ بندی مدتے یکجا بہم   رنگ دیر جا بماند خوے او چوں خر شود

ہندوستان کے اکثر نوجوان دوست بنانے میں پرلے درجے کی بے پروائی برتتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ملک و قوم کی ترقی خود ان کی ذاتی ترقی پر منحصر ہے اور ان کی ترقی ان کے اخلاق پر اور پھر اخلاق ماتحت ہے صحبت کے۔ انکی یہ بے پروائی بربادی کی علامت ہے۔ وہ اپنی کشتی اپنی آنکھوں سے ڈوبتی دیکھکر بھی اتنی ہمت کے مالک نہیں ہیں کہ کمر کس کر اسے بچائیں واللہ اعلم وہ اپنی غفلت۔ خود غرضی نااتفاقی۔ بیدردی کو کب چھوڑینگے ہاں اتنا ہے کہ غیر اقوام کی دیکھا دیکھی فوری جوش تو دکھلانے لگے ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ترقی قوم کے اسرار کیا ہیں۔ وہ دیگر قوموں کے افراد کی ان باتوں میں تو تقلید کرتے ہیں۔ جو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن جان بوجھکر ان امور سے غافل ہیں۔ جن پر فی الاصل ان کے بچاؤ کا دار و مدار ہے۔ ہزار ہا تجربات کے بعد بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں

دوست بنانے کے لئے اصول و قواعد تیار کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ لیکن وہ چار باتیں جنکی بنا تجربہ پر ہے رہبری کے لئے بشرط عمل مفید ثابت ہونگی +

ہمیں اوّل تو دوستی قایم کرنے میں اور پھر جب قایم کریں تو اس کے توڑنے میں ہرگز جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اکثر اشخاص کا قاعدہ ہے جونہی کسی سے آشنائی ہوئی۔ جھٹ اس کے آگے اپنے راز ظاہر کر دیئے۔ اور ایسی بے تکلفی پیدا کرلی۔ کہ گویا وہ کبھی غیر ہی نہ تھے۔ اور چشم زدن میں یار غار بن بیٹھے لیکن ایسے اشخاص کو اپنی اس جلدی کا ثمرہ بھی جلدی ہی ملتا ہے۔ اور پھر نقصان اٹھا کر پچھتاتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ جلدی کی پیدا کی ہوئی دوستی ٹوٹتی بھی جلدی ہے۔ ع۔ بزود رشتہ کشیدہ بزود مے گسلد۔ مناسب ہے کہ ہمارے پاس اس شخص کے پرکھنے کے لیے جس کو ہم اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ چند اصول کسوٹی کی طرح تیار رہیں اور پھر جب دوستی ہو گئی۔ تو اس کے قایم رکھنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرنا چاہیے۔ خدانخواستہ اگر دوست سے نزاع ہو کر تعلق شکستہ ہو جاوے۔ تو ایک تو دوست ہاتھ سے گیا دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دشمن اور بڑھ گیا۔ اور پھر کئی طرح سے تمہارا فایدہ و نقصان اس کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے راز اس کے دل میں ہیں۔ ممکن ہے اس کا دل اس کی زبان کے سپرد کر دے۔ اور یہ امر ہے۔ کہ یہ تاگا ٹوٹا پھر جوڑنا قریباً ناممکن ہے۔ اور بالفرض اگر پھر گانٹھ بھی لیں تو یہ جوڑ ہمیشہ کے لئے ایک ناموافق زمانہ کی یادگار رہ کر کانٹے کی طرح چبھتا رہے گا۔ اور وہ باہمی صفائی جو اس شکست سے پہلے تھی پھر ہونی ممکن ہے +

امریکہ کے ایک مشہور مصنف نے خیالات انسانی کو ایک مکان سے تشبیہ دی ہے جس کے انگریزی طرز عمارت کے موافق دو دروازے ہیں میں سے ایک دروازہ تو شارع عام کی طرف ہے۔ اور اس سے عام آشنا

ملاقات کے کمرہ میں جا سکتے ہیں - اور اس کمرہ سے پھر رستہ پرائیویٹ کمرہ کو جاتا ہے اور شارع عام سے ایک پوشیدہ کوچہ مکان کے دوسرے دروازے کی طرف جاتا ہے جس سے براہ راست آدمی پرائیویٹ کمرے میں داخل ہوسکتا ہے اس خیالی مکان کا پہلا دروازہ بعض آدمی بالکل کھلا رکھتے ہیں - بعض اسے قفل لگا دیتے ہیں - بعض صرف زنجیر پر اکتفا کرتے ہیں جس سے باہر کا آدمی جھانک کر اندر نگاہ ڈال سکتا ہے - لیکن اندر نہیں جا سکتا اور بعض اُس دروازے کو بالکل مسدود ہی کر دیتے ہیں تاکہ دہلیز کے اندر نگاہ کا قدم بھی نہ پڑ سکے +

اس دوسرے دروازے کی ایک چابی تو ضرور ہوتی ہے جو سالہا سال تک ماں کے پاس مخفی رہتی ہے - بعض دفعہ زائد چابیاں بھی ہوتی ہیں جو باپ - بھائی - بہن اور کسی دوست کو خاص موقعوں پر دیجاتی ہیں - ہر لحظہ کے رفیق و ہمراز یعنی خاوند یا بیوی کا بھی حق ہے کہ اُسے اس دروازے کی ایک چابی ملے - اگر نہ ملے تو زندگی طرفین کی یقینی طور پر تلخ ہوگئی - اگر تقدیر نے یہ چابی تمہاری کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دیدی جس کے سینے میں کینہ اور دل میں ظلم بھرا ہوا ہے - تو تم واقعی قابل رحم ہو - اور تمہارا مرض قریباً لاعلاج ہے - اس کا اختتام وانجام یا تو سر شکنی اور خودکشی پر ہوتا ہے - یا اس کے ایام غمگینی اور کس مپرسی کی حالت میں گذرتے ہیں - لہذا اس چابی کو کسی کے حوالے کرتے وقت کمال درجے کی احتیاط چاہیئے - اغلباً انسان کی زندگی کے اکثر حصے کا رفیق وہ شخص ہے - جس سے رابطہ نکاح ہو - اس لیئے اس رفیق کے انتخاب پر انسان کی جملہ راحت و رنج کا فیصلہ ہے - خدا کے فضل

اگر ہمراز ہمخیال اور موافق رفیق سے سابقہ پڑا تو ہزار ہزار شکر گزاری بجا لا اور اگر اس کے برعکس واقعہ ہوا تو تقدیر کے سپرد کر دے۔ اگر ہمراز ہمخیال اور موافق رفیق سے سابقہ پڑا تو ہزار ہزار شکوہ گزاریت
دگرگوں ہے تو اے بیچارے قسمت کے مارے۔ جا اور قسمت کو روتا رہ
خوشی سے ہاتھ دھو اور اپنی تقدیری مایوسی میں معمولی فرائض ادا کرتا ہوا وہ
ایام جو تیرے لئے اس ناپائدار دنیا میں رہنے کے لکھے ہیں۔ گذار دے +

اُس شخص کی دوستی ہرگز قبول نہ کر۔ جس کا میزان حق تمہارے درجہ
تمیز حق سے ادنیٰ ہے جس آدمی میں اخلاق کی قدر نہیں اُس کی صحبت
سے بچتے رہو۔ جو انسان بے اصول زندگی بسر کرتا ہے اُس کی رفاقت
ترک کر دو۔ اور یہ معلوم کرنا کہ کسی شخص میں تمیز حق اور قدر اخلاق ہے
یا نہیں۔ اور آیا اُس کی زندگی کے اصول بھی ہیں یا نہیں۔ کوئی دشوار
کام نہیں ہے۔ اُس کی گفتار سے تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے
دیانتداری۔ راستی بھلائی کا کہاں تک پاس ہے اُس کی رفتار سے
تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس طبیعت کا بندہ ہے۔ کسی خائن آدمی
کی بیجا تعریف کرنا اور جاندار کیڑے پر بے ضرورت وعمداً پاؤں دھرنا اُس کی
طبیعت کی خیانت وظلم کو جھٹ ظاہر کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی سے بھلائی
کرو۔ خوش خلقی سے پیش آؤ۔ نصیحت کرو لیکن دوستی کے قابل نہیں +

دوستی بنانے میں ہمسری رتبہ کا خیال ضرور چاہئے۔ اپنے سے زیادہ
دولتمند سے دوستی رکھنا اپنے میں ضرورت وآمد کی نسبت زیادہ خرچ کرنے
اور کر کے پچھتانے کی عادت ڈالتا ہے۔ لوگ خوشامدی طامع سمجھتے ہیں
اور خود اپنی فروتنی محسوس کر کے ہردم ملول رہتا ہے۔ اپنے سے زیادہ
کی رفاقت زیور دل پر زنگار چڑھاتی ہے یوں تو از روئے انسانیت
ہر فرد بشر تمہارا بھائی اور دوست ہے لیکن ہر ایک سے ایک ہی سلوک

پڑنا خدا تعالےٰ کی منشاء کے خلاف ہے۔ ہاں البتہ آپ سے زیادہ نیک کی صحبت سونے پر سہاگے کا اور زنگ آلود دل پر صیقل کا کام دیتی ہے۔ اپنے سے کم تر انسان سے دوستی اکثر باعث نکبت ہے۔ ہم ان سے خدمات لیکر اپنے سر و لب ہلا دینے کو کافی معاوضہ سمجھتے ہیں

جہاں تمہاری کسی بلند خیال و عالی ہمت شخص سے دوستی ہے۔ وہاں ایک سادہ وضع و سادہ خیال انسان سے بھی اتحاد ضروری ہے۔ حاصل کردہ فیض اس ذریعہ سے بآسانی اوروں کو پہنچا سکتے ہو۔

ایسے شخص ایک لوحِ صفا کی مانند ہوتے ہیں۔ جو پسند آئے لکھو اس لیے اگر تمہیں اپنے ایمان اور افعال پر پورا بھروسہ ہے تو ضرور ایسے انسان مہیا کرو۔ اور ان اشخاص کو اپنے ہاتھوں اپنی مرضی کے موافق اپنے ہمخیال دوست بنا سکتے ہو۔ مگر اسمیں مشق و صبر لازمی ہیں۔

اُس شخص کی دوستی سے دور رہو جسے اُن اشیاء یا اشخاص کی قدر نہیں جو تمہارے نزدیک پاک۔ متبرک اور قابلِ ادب ہیں۔ منکران خدا قابلِ رحم ہیں لیکن اُنکی دوستی قاتل ہے غیر مذہب کے افراد سے دوستی رکھنا نیکی ہے لیکن اگر وہ اسقدر تاریک ضمیر رکھتے ہیں کہ تمہارے خدا تمہارے پیغمبر۔ تمہاری کتب مذہبی۔ تمہارے اوتار تمہارے بزرگانِ دین تمہارے ملک قوم کے بہادروں اور جاں نثاروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو بے شک انہیں چھوڑ دو۔

دوستی کے لیے عاقل و دانا بشر مہیا کرنا لازمی نہیں ہے۔ سادہ و پاکیزہ خیال انسان اچھا ہے۔ ایک معمولی دھات کی لیکن مضبوط پرزوں کی اور ٹھیک وقت دینے والی گھڑی رکھنا از بس مفید ہے سنہری کیس والی کی نزاکت تمہیں بجز تکلیف حفاظت و نگہبانی کے کوئی فائدہ نہیں دیسکتی۔ عقلمند دوست کا کام تو کتابوں سے بھی لے سکتے ہو۔

دنیا میں تین قسم کے دوست ملتے ہیں۔ جانی۔ زبانی۔ اور نانی۔ جانی دوست تو وہ شخص ہیں جو دل سے ہمارے خیر خواہ۔ ہر دم ہمارے ہمدرد۔ ہمیشہ ہماری امداد کو کمر بستہ۔ ہمارے سامنے ظاہر و باطن کے صفا۔ ہمارے دوستوں کے دوست ہمارے دشمنوں سے بیزار۔ غرضیکہ

ہمارے لیے بوقت ضرورت جان دینے کو تیار رہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہیں ہم دوست کہہ سکتے ہیں۔ اور ان کی محبت و قدر ہمارا عین فرض ہے۔

زبانی۔ وہ لوگ ہیں جو منہ سے ہر دم دوستی کا دم بھریں۔ جو اپنی تمکین الفاظ و گزاف اور سخنہائے شیریں و پُر الطاف کو ہمارے کانوں تک ہی محدود رکھیں۔ نہ کبھی ایفائے وعدہ کا ارادہ اور نہ کبھی امداد کو آمادہ۔ ان بیچاروں کی برائے نام دوستی کا بس یہی عوض ہے کہ اپنی میٹھی میٹھی باتیں سنائے جائیں خود سامعین موقع کے مناسب رو کر یا ہنس کر ہاں میں ہاں ملائے جائیں۔ اور مقابل ہمدردی اسلئے ہیں کہ جس دن انہیں کوئی اس قسم کا سامع نہ ملے تو اپنی زندگی کو تلخ سمجھتے ہیں۔

دوستانِ نمائی! نعوذ باللہ! مجھے تو اس جماعت کا نام لیتے بھی ڈر لگتا ہے۔ یہ وہ خود پرست طبیعت کے بندے ہیں جو اپنے دامِ تزویر میں پھنسائے ہوئے قسمت زدگان کو کھا جانے والے ہیں۔ انکی خود غرضی کا دہن بے انتہا کشادہ ہے۔ ان کے ظلم کا شکم ایک غار ہے۔ انکی رہبری کنوئیں میں گرانے والی انکی نصیحت گمراہ کرنے والی۔ ان کا وعظ دوزخ میں لے جانے والا۔ یہ زاہد صورت خود غرضی کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کا ہر ایک کام اسی کی عبادت و اطاعت میں ہوتا ہے اور انکی ہر ایک بات اسکی دعا میں ہوتی ہے اپنی ضرورت کے وقت تمہارے حقیقی برادر۔ صادق دوست۔ خالص مددگار۔ جب تمہاری باری آئے تو نہ تو وہ تمہارے دوست ہیں نہ آشنا۔ نہ بھائی ہیں نہ یار۔ پس اے ظاہر بینو ان ظالم ریاکاروں اور کمینگی کے خانہ زادوں سے بچے رہو۔ انکی شیریں سخنی کے دانہ تلے سیہ دلی کا جال بچھا ہوا ہے"۔

استحکام دوستی کے لیئے چند باتیں مفید ثابت ہونگی

(۱) اپنے گھر کے راز دوستوں سے بھی بیان نہ کرو۔

(۲) دوستوں سے نہ قرض لو نہ انھیں قرض دو۔ حتی الامکان ایسے تعلقات سے بچو۔

(۳) ہمیشہ اُن کے آگے ظاہر باطن صفا رہو۔ میلا دل اور میلا بدن نفرت اور حقارت پیدا کرتے ہیں۔

(۴) اُنھیں کبھی آزردہ نہ کرو۔ ہمیشہ نرمی سے گفتگو کرو۔ کسی قسم کی بحث و مخالفت درمیان نہ لاؤ۔ غصہ کے وقت تحمل سے کام لو۔

(۵) دوستوں کی شکایت غیر کے منہ سے سُننا یا غیر کے آگے کرنا کبھی پسند نہ کرو۔

(۶) دوستوں میں سے کسی کے روبرو ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دو۔

(۷) اگر باہم کچھ رنجش ہو گئی تو جلد معافی مانگو۔

(۸) جملہ شکوک فوراً رفع کراؤ۔

(۹) اگر قول یا فعل میں وہ تمہارے موافق نہیں تو بُرا نہ مانو۔

(۱۰) اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو بے شک دوستوں سے طالب امداد ہو لیکن معمولی یا بالکل وہمی تکالیف کے لیے انھیں تکلیف نہ دو۔

(۱۱) اپنے احباب کے لیے صدق دل کے ساتھ خدا سے دعا طلبی کیا کرو۔

آزمائش کا ایک مجرب طریقہ

چند دوست ہمیشہ مجھے اپنے مکتوبات میں لکھتے رہتے کہ "کار بار لائقہ سے خورسند فرماویں۔ مشکور ہوں گا۔" میں بھی تنگ آ گیا۔ آخر ایک ایک کو مختلف "کار بار لائقہ" لکھنے شروع کر دیئے۔ خواہ ضرورت ہوتی یا نہ ہوتی۔ کسی کو لکھ دیتا۔ اِتنے روپے بھیج دو۔ مجھے ضرورت ہے۔ کسی سے کوئی اور چیز منگواتا۔ علی ہذا القیاس مختلف فرمان بھیج دیئے۔ اس سے مجھے اِتنا فائدہ ہوا کہ اِن احباب میں سے اکثر کے اب خط تھوڑے آتے ہیں۔ جس پر مجھے بھی جواب تھوڑے دینے پڑتے ہیں۔ بعض نے خط و کتابت ہی ترک کر دی۔ اور بعض نے وہ رویہ پُر ریا کلمات لکھنے کا چھوڑ دیا۔ ریا اور ظاہرداری بہت بُری چیز ہے۔ خدا ہمیں راہ راست پر چلائے۔

ا۔ ب طبیب۔ نیوٹن ہال لاہور

خاندانِ شریف

دلّی کانِ جواہر دلّی جو کبھی لعل اُگلتی تھی جس کی خاک پاک سے صاحبانِ اربابِ کمال اُٹھتے اور اپنی رنگارنگ لیاقتوں سے اس فضا میں قوسِ قزح کی سی بہار دکھلاتے تھے۔ جہاں علم و فضل کے چشمے اُبلتے اور مُردہ زمینیں سرسبز و شاداب ہوئیں۔ اب اُس کے یہ جلوے کہاں؟ رشکِ قرطبہ و بغداد جسے جہان آباد ہونے کا فخر حاصل تھا خراب آباد ہو گئی وہ چمن ویران ہو گیا وہ بہار لُٹ گئی۔ وہ نظارے جو کل نظر فریبی کرتے تھے آج خواب ہو گئے لیکن اس "جہانِ خراب" میں اب بھی ایک گھر ہے جس کی تعریف میں ایک دفعہ مولانا حالی نے مومن خاں مرحوم کے حسبِ ذیل شعر چسپاں کیا تھا ؎

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام　　آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

حکیم شریف خاں مرحوم کا خاندان جس میں ایک مدت سے علم، اعزاز اور امارت یہ امتیاز ساتھ ساتھ متوارث چلے آتے ہیں۔ جو اب بھی بزرگوں کے خصائل، بزرگوں کے باقیات الصالحات بزرگوں کے طور طریق سنبھالے بیٹھا ہے۔ ایک مقتدر اور نہایت ہردلعزیز خاندان ہے جس نے طبی خدمات کے سلسلے میں علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے ملک کی مستقل اور بہت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور "زندگی" اور "موت" کی ناگزیر مشکلات کم کرنے میں سلسلہ وار اور باقاعدہ جد و جہد یادگار چھوڑی ہے۔ ارسطو اور بوعلی سینا کی وراثت کو علم و عمل دونوں اعتبار سے اسی خاندان کی کوششوں نے حوادثات کے چنگل سے بچایا۔ اور اپنی "مدد آپ" کا ایسا سدا بہار منظر دکھایا جو تمام عملی آدمیوں کی اُمیدوں کو شگفتہ اور ہمتوں کو مستحکم و استوار بناتا رہے گا۔ اُنہوں نے کوششیں صرف حفاظت و مدافعت کے پہلو تک محدود نہیں رکھیں بلکہ ترقی کو کامل وسعتِ مفہوم کے ساتھ مدِّ نظر

رکھا ماوہ اس کے اعتبار سے جو ضرورتیں محسوس ہوئیں اُن پر احاطہ کرتے رہے۔ طب کی ہی پیمانہ پر وفا باندھا۔ اُسکے اثرات زندہ کرنے کو مبسوط کتابیں لکھیں۔ درس و تدریس کے سلسلے سے اور بالآخر قیام درسگاہ سے ہمدردی کے حقوق ادا کیے۔ اور نسلاً بعد نسل اس قسم کی کوششوں کا تسلسل قائم رکھا۔ اور فرزندانِ وطن پر روشن کرتے رہے کہ کس طرح ملک زندہ بننے کی قدرتی خواہش کس طرح اپنے موجودہ وسائل سے اور اُن وسائل کے ترقی دینے سے پوری ہوسکتی ہے۔ اور کیونکر قدرت کی فیاضیاں اُس حد تک جس درجہ تک وہ ہمارے لیے عام اور سہل ہیں مفید اور سب ضرورتوں پر حاوی بنائی جاسکتی ہیں؟ اس خاندان کی تاریخ بلحاظ ان خدمات کے جنہوں نے زندگی کے ایک سب سے اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ملک کے روبرو بڑے نمونے پیش کیے ہیں۔ بلحاظ تعزز اور منزلت کے جو تو مختلف طرز کی سلطنتوں میں یکے بعد دیگرے اُسے حاصل رہی بلحاظ عام قدر و اعزاز کے جو بے غرضانہ خدمات کے صلہ میں ملک کے ہر ملت و طبقہ کی طرف سے اُنہیں ملا ایثار کے لیے داعی اور محرک۔ فن کے لیے سبق اور ہدایت۔ اور ذاتی فضائل کو آراستہ کرنیکے لیے نمونہ ہوسکتی ہے اور اس لیے نہایت اہم اور مفید شئے ہے لیکن اُسے ایک علیحدہ رسالہ کے لیے اُٹھا رکھا گیا ہے +

ذیل میں صرف اس "گروپ" کے متعلق جو آج مخزن کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اور جس میں تین نارشتہ اصحاب کے سوا باقی "خاندان شریف" کے موجودہ ممبر ہیں۔ چند سطریں لکھی جاتی ہیں تاکہ وہ حضرات جنہیں اس خاندان سے سابقہ تعارف نہیں معلوم کرسکیں کہ اس وقت میں یہ خاندان ملک کی کیسی خدمات انجام دے رہا ہے اور آیندہ کن خدمات کے لیے تیار ہو رہا ہے؟۔

یہ "گروپ" فروری سنہ ۱۹۰۴ء میں حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں مرحوم کے صاحبزادوں کی شادی کی تقریب پر لیا گیا تھا۔ اگر حکیم غلام رضا خاں صاحب کی شبیہ اس میں ہوتی جو فضل و کمال ورع و اتقا اور آئین شرافت کے بچپن سے بڑھاپے تک پابند ہونیکے لحاظ سے اپنے

خاندان میں فرد کامل ہیں۔ تو جہاں تک موجودہ مشاہیر کا تعلق تھا یہ گروپ اس خاندان کی نسل موجودہ کا مکمل مرقع ہو جاتا۔ اس گروپ میں مقام صدر پر جو بزرگ نظر آتے ہیں حکیم حاجی غلام رسول خاں صاحب ان کا نام ہے۔ اب یہ اپنی دنیوی زندگی ختم کر چکے ہیں اور مہاجر ہیں۔ جب وطن کی کشش غالب ہوئی چلے آئے۔ ورنہ حجاز میں رہتے ہیں اور وہیں عمر بسر کرنی چاہتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ پر حکیم غلام نبی خاں صاحب ہیں کلکتہ جیسے مقام پر ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو طب یونانی کا گرویدہ بنا لینا جو بالکل اس سے مانوس نہ ہوں۔ انہیں کی حذاقت فن کا کام تھا۔ انہوں نے ایک مدت دراز تک نہایت کامیابی اور اعلیٰ اعزاز و منزلت کے ساتھ کام کرنے کے بعد ۶۳ برس کی عمر میں ۷۔ رجب ۱۳۲۵ھ ہجری کو انتقال فرمایا۔ اور چار لائق و فائق صاحبزادے یادگار چھوڑے جن میں سے حکیم عبد السمیع خاں جو اب اُن کے جانشین ہیں اسی سمت صدر کی نشست سے تیسرے نمبر پر ہیں۔ دوسرے حکیم عبد الرشید خاں بائیں طرف صدر سے چوتھے نمبر پر۔ حکیم غلام کبیر خاں جو اُنکے چھوٹے فرزند ہیں بہ مستعدی اور قابلیت کے ساتھ تعلیم پوری کر چکے ہیں۔ اور امید ہے کہ مثل اپنے والد مرحوم کے کامیابی حاصل کرینگے ۔

حکیم غلام نبی خاں مرحوم کے برابر حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں [illegible] ہیں۔ یہ نہ صرف اپنے خاندان کے صدر نشین ہیں بلکہ طب ہندوستانی کی جو رونق اب نظر آتی ہے انہیں کے دم سے ہے اور آئندہ ملک کی اس سب سے اہم ضرورت کا سرانجام بہت کچھ انہیں کی ذات سے وابستہ ہے۔ ہندوستان میں اول درجہ کے طبیب ہونے کے علاوہ بہت بڑے فاضل اور ادیب ہیں۔ عربی اور فارسی میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن سے تحریر و تقریر کرتے ہیں۔ اور نہ معمولی نوشت و خواند بلکہ اعلیٰ پایہ کی علمی تصنیفات کر سکتے ہیں چنانچہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر انہوں نے بھی طبی لٹریچر پر نہایت مفید اضافہ کیا ہے۔ ذہانت و طباعی کے علاوہ بہت عرصہ تک علمی زندگی بسر کرنے کے سبب ان کی علمی حیثیت میں جو شان

پیدا ہو گئی ہے اُس نے اِنکی علمی قابلیت سے بلکہ انہیں ملک کے لیے اِس درجہ مفید بنا دیا ہے کہ حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے اُمید نہیں کہ قریب زمانہ میں اِن کی شان کا کوئی دوسرا شخص پیدا ہو۔ مدرسۂ طبیہ جب اِن کے برادرِ بزرگ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم نے قائم کیا۔ یہ اُسی وقت سے اِس کام میں اُن کا دست راست تھے اب یہ اُسکے سکرٹری ہیں۔ اور اُسکی قسمت کا حل و عقد انہیں سے وابستہ ہے۔ اِسکے علاوہ بے زبان اور بے کس و بے بس طبقۂ نسوان کی حالتِ زار کے لحاظ سے یہ ایک "دائیوں کا مدرسہ" اور ایک "زنانہ شفاخانہ" قائم کرنے والے ہیں۔ تاکہ نسوانی امراض میں عدم طبی امداد نہ ملنے سے جو دردناک حادثے ہوا کرتے ہیں موقوف ہو جائیں۔ اور زنانہ شفاخانہ میں غریب عورتوں کو وضع حمل کے زمانہ میں بلا معاوضہ مدد دی جائے۔ ہم نے خدا کے حکم اور تمدن کے اقتضا سب کو بالائے طاق رکھکر اپنی عورتوں سے اس درجہ سرد مہری بلکہ میں جوشِ انصاف سے کہوں گا اس درجہ ظلم جائز رکھا ہے کہ اس فرض کے متعلق جو اپنی "ماؤں" "بہنوں" "بیٹیوں" اور "بیویوں" کا ہمارے اوپر ہے ہماری حس مردہ ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مہینے میں نہیں بلکہ پہلے سال کے بعد بھی یہ ضرورت نظر آتی ہے کہ حاذق الملک ہماری "رحم دل" سرکار کے بھروسے پر تحریک کی رفتار نہ چھوڑ بیٹھیں بلکہ اپنے اثر اور اقتدار سے کام لیں۔ اطمینان یہ ہے کہ تحریک اُن کے ہاتھ میں ہے اور انکی پوری توجہ یہ بیڑا پار لگاکے رہے گی +

حاذق الملک نے حکیم شریف خاں مرحوم کا مقصد جو ویدک اور یونانی کے اتحاد پر مبنی تھا۔ اور جس نے مستقل کتاب اُن سے لکھوائی پورا کرنے کے لیے طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی ہے اور ویدوں اور طبیبوں دونوں کے لیے ایک مشترک پلیٹ فارم پیدا کیا ہے تاکہ اِس مشترکہ جد و جہد سے وہ تمام ضرورتیں رفع ہو جائیں جو اہلِ وطن کو بقائے زندگی کے لیے پیش آتی ہیں۔ اور "دیسی طب" ہر حیثیت سے مکمل اور مفید بن جائے +

یہ کام جن کا اُنہوں نے بیڑا اٹھایا ہے نہایت اہم اور ایثار طلب ہیں اور ہر ایک کا تقاضا یہ ہے کہ کوشش کا مرکز اسی کو بنا دیا جائے لیکن جب بہت سی صورتیں جمع ہو جائیں اور اُن کا احساس بھی فقط ایک دل کا حصہ ہو۔ ناممکن ہے کہ درد مند طبیعت کو اُن میں سے کسی کا نظر انداز ہونا گوارا ہو جائے۔ حاذق الملک باوجودیکہ اُن کے پاس بہت تھوڑا ذاتی وقت رہ گیا ہے اِن کاموں کو اپنے آرام پر بھی ترجیح دیتے ہیں اور ایک بڑی محنت گوارا بھی جبکہ پوزیشن وقعت اور ہردلعزیزی پر نظر کی جاتی ہے جو اُنہیں ہندوستان بھر میں ممتاز بناتی ہے تو یہ کام اہمیت کے باوجود اس قدر دشوار نہیں رہتے کہ اُن میں سے کسی کو ملتوی کرنے اور کسی کے لیے پوری محنت وقف کیے جانے کا مشورہ ناگزیر ہو*

حاذق الملک اِن خدمات کے علاوہ اور قومی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ نمونہ ہے وقت کو سلیقہ سے استعمال کرنے کا اور سچے ایثار علی النفس کا*

صاحب صدر کے تین بیٹے حکیم واصل خاں مرحوم ہیں۔ یہ فخر خاندان تھے اور اپنے وقت میں اتنا کام کر گئے ہیں جو اُن کا نام ہمیشہ خاندان کے اُفق پر روشن رکھے گا۔ طرز علاج میں یہ بالکل اپنے والد حکیم محمود خان مرحوم کا تتبع کرتے تھے اور جو شفا دست طبیب کے ہاتھوں میں تھی اُس کا حصہ انہیں عطا ہوا تھا۔ افسوس ۵ فروری سنہ ۱۹۰۴ء کو بے مہری فضا نے اِن کا چراغِ زندگانی وقت سے پہلے گل کر دیا۔ ان کے برابر حکیم حاجی احمد سعید خاں صاحب ہیں۔ یہ آنریری مجسٹریٹ میونسپل کمشنر اور دلی کے میونسپل بورڈ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ انہوں نے حاذق الملک حکیم عبد المجید خان مرحوم کے آگے زانوے ادب تہ کیا اور بمبئی میں بہت کامیابی کے ساتھ فنِ شفا کا فیض جاری رکھا ہے۔ باطن متواضع اور متدین آدمی ہیں۔ امسال بعض دوسرے ابنائے خاندان کے ساتھ فریضہ حج ادا کر کے آئے ہیں۔ اور اس مرتبہ پر شہر نے بلا اختلاف مذہب و ملت اِن کا اس دھوم سے استقبال کیا کہ لوگوں کا بیان ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے بعد کسی قافلہ حجاج کا اس قدر شاندار

استقبال دیکھنے میں نہیں آیا - یہ اِن کی اور اِن کے خاندان کی وقعت اور ہردلعزیزی کا خط ایک نظارہ تھا - اِن کے قریب حکیم فاضل خاں صاحب بیٹھے ہیں - جنھوں نے طبی تعلیم حکیم غلام رضا خاں صاحب کے حلقۂ درس میں تمام کی اور اپنے فن سے فطری مناسبت ہونے کے باعث جو کچھ سیکھا اُسکا نہایت کامیابی سے استعمال کیا - اِن کی خدمات بہت اعزاز کے ساتھ بعض ریاستوں سے متعلق رہیں - اِستادہ صف میں بائیں طرف سے پہلے نمبر اور صدر کے ٹھیک عقب میں حکیم حاجی محمد احمد خاں ابن حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم ہیں انہوں نے تعلیمی جدوجہد ختم کر لی ہے اور دوران تعلیم سے والد اور چچا کے زیرِ نگرانی فن کے متعلق اسرار و نکات حاصل کر رہے ہیں - قابلیت کے ساتھ روشن خیالی اور جدت پسندی اور وہ تمام اوصاف جو انہیں "اَلولد سرٌّ لابیہ" کا مصداق ثابت کر رہے ہیں اُنہیں مبدا فیاض نے عطا کیے ہیں - طب ہندی کی وہ شاخ جو اِن کے خاندان کی طبابت کو پوری دیسی طبابت ثابت کرتی رہی ہے - اِس کی طرف اِنہیں ذاتی شغف ہے اور وہ اِس کے متعلق محنت و استقلال سے تجربے اور علم کو وسعت دینے میں مصروفِ سعی ہیں - اِن کے خاندان اور خصوصاً اِنکے والد کے (جو بلاشبہ آسمان طب کے آفتاب تھے) بے شمار دوستوں کو نہایت مسرت ہے کہ انہوں نے وہ لیاقتیں جو دَورِ آئندہ میں اِس خاندان کی ممتاز صفتوں کے قائم رکھنے کی ضمانت ہو سکتی ہیں - توجہ محنت اور ذاتی دلچسپی سے پیدا کر لیں +

اِن کے برابر اِن کے چھوٹے بھائی حاجی ظفر حسین خاں ہیں - یہ بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جو خصائل اِن سے ظاہر ہوئے - اُن سے اُمید ہوتی ہے کہ جس طرح شباہت اور کیریکٹر میں اپنے والد کی تصویر ہیں - اسیطرح علم و فضل اور خدماتِ خلق کے لحاظ سے اُنکے خلف الرشید ثابت ہونگے - اِن کے پیچھے غلام رسول خاں ہیں اور اِنکے برابر حکیم غلام کبریا خاں ہیں - انھوں نے دورانِ تعلیم میں غیر معمولی ذہانت اور فراست ظاہر کی ہے یہ حکیم حاجی احمد سعید خاں کے فرزند اور حکیم محمود خاں مرحوم کے نواسے ہیں - حاذق الملک

حکیم محمد اجمل خاں کی نگرانی میں انہیں نہایت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔ اور بدو شعور سے ہونہار دیکھکر اس اہتمام سے ان کی تربیت کا فرض پورا کیا گیا ہے کہ آیندہ بہتر فرائض خاندان جو انہیں ملنے والے ہیں پوری کامیابی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ حکیم محمد محمد خاں اور یہ نئے دور کے لیے وہ نوجوان ہیں۔ جن کی ذات سے طب ہندوستانی کی امیدیں ضمیموں اور حواشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مطالعہ پسند اور معلومات میں ہمیشہ اضافہ کی کوشش کرنے والے ہیں۔ اور ممتاز خاندانی خصائل اور کمالات کی موجودگی نے اِن کا مستقبل بہت صاف اور روشن بنا دیا ہے ؛

اِن کے قریب حکیم محمد نصیر خاں صاحب ہیں جو بمبئی میں مطب کرتے ہیں اور قابلیت کے علاوہ مہرووفا میں اپنے خاندان کا ایک نمونہ ہیں۔ بچوں کی صف کے عین وسط میں جو چھوٹی شبیہ نظر آتی ہے یہ محمد جمیل خاں ابن حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں ہیں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس اہتمام کے ساتھ جس کی مسلسل تعلیم کے اُنکے والد جیسے مبصر سے اُمید ہوسکتی ہے ؛

عبدالقدیر دہلوی

محبت فرزندی! اسکندر اعظم کی ماں اولمپیا ایسی تند خو و تنک مزاج تھی کہ وہ معاملات سلطنت میں اُس سے کسی طرح کام نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن اولمپیا دوسروں کی حرکات و سکنات کو تاڑتی رہتی تھی۔ اور اپنے بیٹے سے تمام آدمیوں کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔ سکندر ماں کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھا۔ مگر اُسکی شکایتوں کو خوب دل لگاکر سُنتا اور لطائف الحیل سے ٹال دیتا تھا۔ ایک بار اینٹی پیٹر نامی نائب السلطنت یورپ نے سکندر کو ایک طویل عرضداشت بھیجکر اولمپیا کے دخل در معقولات کی شکایت کی مگر سکندر نے اُسے جواب میں لکھا کہ "کیا تجھے خبر نہیں کہ میری والدہ کا ایک آنسو ایک ہزار چٹھیوں کو دھو ڈالتا ہے" ؛

گسائیں تلسی داس جی

رامائن کے نامور مصنف کی تصویر جو گزشتہ پرچے میں شائع ہو چکی ہے وہ ہمیں جناب بابک رائے صاحب شاکر نے اس دلچسپ مضمون کے ساتھ عنایت کی تھی جو اس مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ جناب شاکر کی تلاش داد کے قابل ہے۔ مضمون اور تصویر دونوں کے لیے ہم اُن کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

گسائیں تلسی داس جی ذات کے برہمن اور موضع راجپور ضلع باندہ کے متوطن تھے۔ اُنکے والد کا نام **آتمارام دوبیدی** اور والدہ کا نام **ہولاسی** تھا۔ آپ کی پیدائش سمت ۱۵۸۹ میں ہوئی چونکہ ہندو شاستروں کی رو سے آپکا وقت پیدائش ایک ایسی گھڑی تھی کہ مولود کو ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دیا جائے۔ لہٰذا آپکے والد نے جو اپنے مذہب کے ایک پکے معتقد تھے۔ اُن کو باہر پھنکوا دیا **مہاتما نرسنگھ داس** سادھو نے اُنکو اُٹھا کر اپنی کُٹی میں منگوا لیا۔ اور اچھی طرح سے اُن کی پرورش کی۔ اور جب ذرا ہوشیار ہوئے تو "گرو دکشا" دیکر اُنکو اپنا شاگرد بنا لیا اور اُنکا نام **تلسی داس** رکھا۔ اس سے پیشتر وہ ہمیشہ اُنکو **رام بولا** کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

اُن دنوں ایک مشہور پاٹھک **مہاتما دین بندھو** قریب ہی رہا کرتے تھے اُن کی بیٹی **رتناولی** نہایت خوبصورت اور نازک بدن تھی۔ باپ کی تعلیم و تلقین نے لڑکپن ہی سے اُسکے دل میں ایک اچھا بیج بو دیا تھا۔ اس نیک تربیت کے باعث وہ ایک خدا پرست لڑکی بن گئی تھی۔ جب بالغ ہوئی تو باپ کو اُسکے شادی بیاہ کی فکر ہوئی۔ اِدھر **گسائیں تلسی داس جی** بھی سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے۔ ایک آدمی کو درمیان میں ڈالکر گسائیں جی نے اپنا عندیہ **مہاتما دین بندھو** پر ظاہر کیا۔ اُنھوں نے یہ درخواست منظور کر کے نہایت دھوم دھام کے ساتھ دونوں کی شادی کر دی۔ حق یہ ہے کہ یہ جوڑا ایسا اچھا بندھا کہ اسکی نظیر بہت کم

دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک عالم اور خدا پرست شخص کو جو خوشی ایک تربیت یافتہ اور نیک بیوی کے ملنے سے ہوتی ہے اُسکا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے مہاتما دین بندھو جی ایک قابل داماد ملنے کے باعث از حد خوش تھے۔ نیک رتناولی ہمیشہ شوہر کی خدمت و پاسداری میں مشغول رہتی تھی۔ گسائیں جی کو بھی اُن سے اِسقدر الفت و محبت تھی کہ دم بھر کو بھی اُنہیں اپنے پاس سے جدا نہ کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد خدا تعالیٰ نے اُن کو اولاد نرینہ عنایت فرمائی کہ جسکا نام تارک رکھا گیا۔ اِس الٰہی بخشش سے اُن دونوں کا رشتۂ اُلفت اور بھی زیادہ مضبوط ہوگیا۔ رتناولی کے والد نے کئی بار اُسکے بلانے کو آدمی بھیجا مگر گسائیں جی نے اُسکی جدائی کو منظور نہ کیا۔ آخر کار رتناولی کا بھائی اُسے اپنی ہمراہ گھر لے جانے کے لیے آیا۔ اِس دفعہ اُس نے خود بھی اپنے باپ کے گھر جانے میں زور لگایا مگر گسائیں جی بالکل راضی نہ ہوئے۔ اتفاقاً کسی کار ضروری کے لیے گسائیں جی کو باہر جانا پڑ گیا۔ رتناولی بلا اجازت اُنکی عدم موجودگی میں بھائی کی ہمراہ باپ کے گھر روانہ ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد گسائیں جی واپس آئے رتناولی کو وہاں موجود نہ پاکر سخت بیکل ہوئے۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر آس پاس کے رہنے والوں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ گسائیں جی تابِ مفارقت نہ لاکر فوراً اُسکے سسرال کی طرف روانہ ہو پڑے۔ رتناولی ابھی رشتہ داروں سے اچھی طرح ملنے بھی نہ پائی تھی کہ گسائیں جی بھی جا پہنچے۔ اُن کو دیکھکر وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ جھنجھلا کر خوشامدانہ لہجہ میں بولی:۔

"پران ناتھ! جو محبت تمکو مجھسے اور میرے ناپائیدار جسم سے ہے۔ اگر یہی محبت
شری رام چندر جی سے ہوتی تو دین و دنیا دونوں کو کما لیتے۔"

گسائیں جی ایک گیانی پنڈت تھے۔ اُنکے دل پر یہ بات تیر کی طرح لگی اور کچھ عرصہ کی چھپی ہوئی آگ ایکدم بھڑک اُٹھی۔ فوراً تمام تعلقات دنیوی پر لات مار کر کاشی جی (بنارس) کی طرف روانہ

ہوگئے۔ اور وہاں پہنچکر دن رات یاد الٰہی میں مگن رہنے لگے ۔

گُسائیں جی کی زندگی کا سب سے بڑا اور مشہور واقعہ یہی ہے کہ جس نے آن کی آن میں اُنکی کایا پلٹ دی۔ عورت کی ایک ذرا سی بات نے اُن کے دل کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے موڑ دیا۔ اور رفتہ رفتہ اسکا یہ نتیجہ نکلا کہ **راماین** جیسی مشہور و معروف کتاب آج دنیا میں موجود ہے۔ یہ وہ نہ مٹنے والی یادگار ہے جو ہزاروں دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے ۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں جو ہردلعزیزی اور شہرت **رامائن** کو حاصل ہے وہ کسی اَور کتاب کے حصّے میں نہیں آئی۔ کہنے کو وہ ایک مہاراجہ کی سوانح عمری ہے مگر اسمیں فرائض کے ایسے بہترین نمونے پیش کیے گئے ہیں کہ جنکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ اسمیں اُس زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جو قدیم آریوں کی نگاہ میں مکمل کہلاتی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ ہندو اس کتاب کے صدہا زیر بار احسان ہیں۔ کوئی ہندو خواہ کسی فرقہ یا گروہ کا ہو ایسا نہ ملیگا جسنے **رامائن** کو پڑھا یا سُنا نہو اور اُسکے دل پر اُسنے ایک نیک اثر نہ ڈالا ہو۔ یہ درست ہے کہ **رامائن** ایک قصہ ہے۔ مگر دراصل یہ وہ بے نظیر قصہ ہے کہ جسکے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دلمیں وہ سچے خیالات سرایت کر جاتے ہیں اور وہ اوصاف جو کمالات انسانی کا نچوڑ ہیں ہمارے سامنے آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ راستبازی۔ ایفائے عہد۔ فرزندانہ اطاعت۔ پدرانہ محبت و علم **تحمل** عفو غرضیکہ کوئی ایسی خوبی نہیں جسے جادو نگار شاعر نے نظرانداز کردیا ہو۔

مگر وہ بات جسکے باعث دیگر اقوام و مذاہب کے لوگ بھی **رامائن** کو اپنے دلوں میں ایک اچھی اور ممتاز جگہ دیتے ہیں یہ ہے کہ اُسنے **ہندو علم ادب** کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسمیں **کامیابی** کچھ شاعرانہ بلند پروازی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسکے مصنف کی غیر معمولی قابلیت اور دیگر خداداد عطیات کی بدولت ہے۔ گر **نفیتھ** صاحب کا یہ قول کہ "رامائن دنیا میں ہر وقت ہر ملک کے علم ادب کو برابر کامیابی کے ساتھ چیلنج دیتی رہیگی اور انسانی کمال کی یہ مکمل تصویر جو رام اور **سیتا** میں نظر آتی ہیں کہیں اور نہ ملینگی" ایک حد تک درست ہے ۔

گسائیں تلسی داس جی کے باب میں مؤلف رہنمایان ہند نے لکھا ہے کہ وہ شروع شروع میں راجہ صاحب بنارس کے دیوان بھی رہے ہیں اور بعد ازاں فقر و زہد اختیار کر کے بندرابن کو چلے گئے بہت سے مقامات کا سفر کیا اور پھر بنارس میں واپس آئے۔ اور یہیں پر رامائن لکھی اور اواخر زندگی کا حصہ بھی اسی متبرک شہر میں گزارا ۔

اگر گسائیں جی کے چہرے کو غور سے دیکھا جاتا تو ماہرین علم فرنیالوجی کے قائم کردہ حدود کی رو سے معلوم ہوگا کہ آپ کی قوت ادراک بہت بڑھی ہوئی تھی اور یہ وہ نعمت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ شری رامچندر جی نے گسائیں جی کو خواب میں حکم دیا کہ وہ رامائن کو تصنیف کریں چنانچہ سمت ۱۶۳۱ میں رامائن لکھنی شروع کی۔ بال کانڈ میں اسکے شروع کرنے کی تاریخ لکھتے ہیں ۔

سمت سولہ سو اکتیسا (۱۶۳۱) کروں کتھا ہری پد دھر سیسا   نومی بھوم وار مدھو ماسا   اودھ پوری یہ چرت پرکاشا

گسائیں جی بھاکا زبان کے شاعروں میں بہت ممتاز مانے جاتے ہیں۔ انکی لکھی ہوئی رامائن کی دو قلمی تحریریں بھی متبرک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک تو انکے وطن راجپور میں ہے اور دوسری شری سیتارام جی کے مندر، بنارس میں۔ ایک اور بہت پرانی کتاب مہاراجہ کاشی کے پاس بتائی جاتی ہے۔ مگر اسکی نسبت یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گسائیں جی کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ انکی وفات کے چوبیس برس بعد یعنی سمت ۱۷۰۴ میں انکے دست نوشت نسخے سے نقل کی گئی ہے۔ گسائیں جی کی تصانیف اسقدر ہیں (۱) کبت رامائن (۲) گیتاولی (۳) دوہاولی (۴) چھپے تیرکا (۵) کرشن گیتاولی (۶) رام ست سئی (۷) [illegible] (۸) رام للا نہچھو (۹) بیراگ سندیپنی (۱۰) بروا رامائن (۱۱) کنڈلی رامائن (۱۲) رولا رامائن (۱۳) کرکھا رامائن (۱۴) جھولنا رامائن (۱۵) پاربتی منگل (۱۶) جانکی منگل (۱۷) سنکٹ موچن (۱۸) ہنومان باہک (۱۹) رام شگناولی

گسائیں جی نے اسی گھاٹ بنارس میں ۹۱ برس کی عمر میں یعنی سمت ۱۶۸۰ میں وفات پائی جیسا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے دوہا سمت سولہ سو اسی (۱۶۸۰)۔ اسی گنگ کے تیر ۔ شراون شکلا سپتمی تلسی تجیو شریر ۔

ہم نے بہت کوشش و تجسس سے کام لیا مگر افسوس کہ گسائیں جی کے کچھ اور حالات دریافت نہ ہو سکے۔ اب کتابیں تلاش کیں مگر وہ ایسے بیانات سے پر ہیں کہ ہمارے دل نے انہیں صحیح تسلیم نہیں کیا۔ ہیرو ورشپ

شیر و شکر

واعظِ خوش بیان، طوطیِ ہندوستان، مولانا مولوی حافظ محمد عبدالاحد صاحب اسنخ مرحوم دہلوی نے ایک صاحبِ دل کے خیالات جو سفید کاغذ پر سیاہ حروف دیکھکر اُن کے دل میں گزرے پُر از عرفان نثر میں لکھے ہیں۔ مولانا مرحوم کے حقیقی بھتیجے جناب حافظ محمد عبدالقدوس صاحب قدسی وکیل ریاست بہاولپور نے ان پاکیزہ خیالات کو نظم کیا ہے اور اس مجموعہ کا نام شیر و شکر رکھا ہے۔ اسلئے ہم اسی عنوان سے نثر و نظم دونوں کو شائع کرتے ہیں۔

ایک **صاحبدل** نے سفید کاغذ پر سیاہ حرف لکھے دیکھے۔ کاغذ سے پوچھا کہ تو کس بلا و مصیبت میں مبتلا ہو کر سیاہ پڑ گیا ہے۔ تجھپر ایسی کیا بن گئی ہے؟ اچھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ **کاغذی** نے تجھپر ظلم کیا ہے۔ پہلے تجھکو کوٹا پیٹا۔ پھر پانی میں ڈبویا۔ پھر دیوار پر دے مارا۔ بعدہٗ تیرا بند بند جدا کر دیا۔

صاحبدل

ایک **صاحبدل** کا فرضی ماجرا لکھتا ہوں میں — چند اسرارِ نہاں کو آج کرتا ہوں عیاں
ہوتے ہیں ایسے فروتن ہی ذرا عالی خیال — خود زمیں پر ہے۔ فکرِ عالی وقفِ سیرِ آسماں
دیکھا قرطاسِ سفید اک اُسنے کچھ حرفِ سیاہ — دفعتہً اُٹھا میانِ قلبِ مضطر سے دھواں
پوچھا **کاغذ** سے کہ تجھپر کیا بنی اے سیمتن — ماہ رو! ابرِ سیہ میں تو ہوا کیونکر نہاں
ہاں کیا ہی **کاغذی** نے تجھپہ شاید یہ ستم — کوٹا پیٹا پہلے۔ پھر دریا میں ڈالا ہے یہاں
پھر نکالا واں سے۔ اور دے مارا اک دیوار پہ — بند بند اس نے جدا کر کے بنایا نیم جاں

کاغذ

بیشک کاغذی نے مجھکو ستایا ہے تکلیف دی ہے مگر میں یہ تکلیفیں نہ جھیلتا
باریوں میں داخل نہ ہو سکتا تکلیف ہی کی بدولت میں بادشاہ کا مصاحب بن گیا ہوں

پس تکلیف سے ہوتا ہے میسر حق آگاہ بے تکلیف
گدائے شاہ رہتا ہے حضور شاہ بے تکلیف

یہ تکلیفات دیتی ہیں اہل ہمت کو راحت جان ہے
مطیعان نبی رہتے نہیں اللہ بے تکلیف

الٰہی کس مزے کا عشق ہے تیرا کہ خود عالم
کھنچا جاتا ہے تیری سمت بے اکراہ بے تکلیف"

کاغذ

قرطاس مصفا سچ کہا اے نیک دل
کاغذی نے کر دیا مجھکو ضعیف ناتواں

تکلیفیں بہت پہنچی ہیں اُسکے ہاتھ سے
ورنہ سہتا انکو تو دربار میں ہوتا کہاں ؟

ہوں ان مصائب کی بدولت شاہ تک
بن گیا میں اب مشیر بادشاہ نکتہ داں

درست ہے بے تعب جھیلے نہیں ملتا ہے کچھ
تاؤ کھا کھا کر ہوا ہے سکۂ شاہی رواں

صحاجلد

جلدگر نے تجھپر ستم کیا ہے کہ شکنجے سے تجھکو کاٹا۔ اجزا جدا جدا کیئے۔ شکنجے میں
کسا۔ بازاروں میں پھرایا۔ تو اس رنج سے سیاہ ہو گیا ہے"۔

صحاجلد

ہمارا جلدگر نے تجھکو بے تقصیر آہ
کاٹ کر شکنجے سے اجزا کر دیئے تیرے عیاں

شکنجے میں کسا۔ کھینچے پھرا بازار میں
اسلیئے چہرے پہ تیرے ہے سیاہی کا نشاں

"کاغذ

یہ ظلم نہ کاغذی نے کیا ہے نہ جلدگر نے۔ یہ سب مہربانی سیاہی یعنی
روشنائی کی ہے۔ اُس سے پوچھو"۔

کاغذ

کاغذی نے کچھ کیا نے جلدگر نے کچھ کیا
سب عنایت روشنائی کی ہے یہ اے مہرباں

پوچھتا ہے آپ کو گر کچھ تو اُس سے پوچھیے — کر دیا جس نے سوادُ الوجہ مجھ کو ناگہاں

صاحبدل

اے سیاہی تو تو چراغ کی اولاد ہے۔ تجھکو نور پھیلانا چاہیے نہ سیاہی۔ اے سیاہی تو تو گوشہ نشین دوات۔ اور صوف والی ہے۔ صوفی ہو کر ایسا ظلم۔ اور چراغ کی اولاد ہو کر ایسا اندھیر۔ کہ کاغذ کو سیاہ کر دیا۔ خدا کے روبرو جانے سے شرماتے ہیں وہ ڈرتے ہیں جو روشنی میں رہ کر ایسا اندھیر کرتے ہیں۔

صاحبدل

اے سیاہی روشنائی بھی تو اولادِ چراغ — تو کہاں جا تو نے کیوں باندھا ہے ظلمت کا سماں
آسمانِ رخ پہ تیرے چھا گئی کالی گھٹا — ہو گئی صورت ہی مسخ اب الحفیظ و الاماں
حیف اے روشن ضمیر افسوس اے آبِ روش — مہ تاباں ہو کے تو کیوں بن گئی زلفِ بتاں
تھی تو اک گوشہ نشین خانۂ چشم مداد — تو لباسِ صوف میں گویا تھی صوفی زماں
اے خدا ناترس کاغذ پر یہ جورِ ناروا — کیوں حبش میں سکّہ ڈال آئی نہ لکھا کیا یہاں

سیاہی

میں نے جب سیاہی ساز کے ہاتھوں تکلیف پائی ہو گوشہ نشین ہو گئی ہوں دوات کو اپنا حصہ سمجھا تو میں نے نیت کر لی تھی کہ اپنا کالا منہ کسی کو نہ دکھاؤنگی۔ مگر کیا کروں قلم نے نیزہ مار مار کر مجھے گوشۂ عافیت سے نکالا۔ اور کاغذ پر ظلم کرنے کی بابت کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے لگا دیا۔ یہ گناہ قلم کا ہے اُس سے پوچھو۔

سیاہی

چھوٹ کر جورِ سیاہی گر سے ہوں عزلت گزیں — جانتی ہوں سے دوات اپنا حصار عود جہاں
میری نیت میں تھا کالا منہ نہ دکھلاؤں کہیں — پر کروں کیا مار کر نیزے قلم لایا یہاں
گوشۂ امن و اماں سے کھینچ لایا ہے مجھے — اور کلنک اپنا لگایا بے گناہ بے جرم ہاں
یہ گنہ سدا قلم کا ہے اُسی سے پوچھیے — ورنہ میں ہوں ضعیف ایسی ہلاکو تھی کہاں

صاحبدل

قلم! تن و قلم کا تاج تیرے سر پہ رکھا گیا۔ اور سیف و قلم تو ماں کو بھلا تیری کرے بانہ
بالیدہ تو سنہ سیاہ پوش صوفی کو ہمسے حجرے سے نکالا۔ کا حذف کر دیا۔

صاجدل

قلم، تو سر چڑھ سے تن نون بجسم — اور یہ سیف قلم کا تو امان مجسم نشاں
والیسے نضائل سے کیا تو نے ستم — ایک صوفی سیہ پوش ہے مصنف بغاں
مجھ سے نکال اسکو کیا آوارہ گرد — توڑ ڈالا حذف اس کا یہ جو ہے بیکراں

قلم

وضو ہی کے کنارے کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس صوفی کے آزار کا خیال نہ تھا۔ مگر قسیا
نہ وہ دست ہاتھ نے مجھے ہاتھ میری نوک کو نوکِ سناں بنایا۔ اور دوست پر ظلم سیدھ

قلم

دیجیے۔

جو سے چمن ہست اور مصروفِ نماز — پڑھتی رہتا تھا محو طاعت جانِ جہاں
ہمیں آتا نہ تھی ہر یک طینت کا کبھی — دفعۃً مجھکو بنایا دست قاطع نے سناں
سناں بھی وہ کہ ہو جاسے جگر کے آر پار — زخم کی جاں۔ رزم میں نوکِ سناں جانستاں
سے حضرت گر پوچھیں تو پوچھو۔ آنکھ — پوچھتے ہو مجھسے کیا اسے گروہ عاقلاں

صاجدل

تیری انگلی میں قوت و سلطنت کی انگشتری ہے تمام اعضا میں تو زبردست ہی جو زیردست
پہ ظلم۔

صاجدل

اے ہاتھ! میں بہت تجھسے کیا کہوں — تو نے اک صحرا نشیں کا بدگو پہنچا یا زیاں
انگشت قوی میں ملک کی انگشتری — وہ انگوٹھی جسکو کہیے خاتم پیغمبراں
کی مہر سلیماں اور نگینِ سلطنت — اُس کو رہنا چاہیے تھا بن کے مثل سائباں
ہو زبردستو آتے میں لرم — تو نے کیوں برعکس اسکو کر دیا اے بیزباں

سر قلم کو کب تک سر بری دیا تو نے قلم — اور بس میں نعل بے جیہ سے جو یہ شمارہ

ہاتھ

میں تو گوشت پوست ہوں، تم میں طاقت قطع و برید کہاں؟ پر دم صاحب دست کی طاقت سے گیا ہو۔ طاقت سے پوچھیے۔

ہاتھ

پوچھیے کا صاحب دید جناب من یہ حال — ورنہ دستہ بہ بہو جسکے ہیں مشکل کہاں
ورنہ میں خود کیا ہوں بس اک تودہ سا گوشت — تھا جب جسم میں طاقت کا یہ سب اشتعال

صاحبدل

اے طاقت! تو نے ہاتھ کو تکلیف کیوں دی محتاج کو کیوں ستایا؟

صاحبدل

طاقت اے سرپنجہ فولاد ہاں جلدی بتا — دست کو بیدست پا تو نے بنایا کیوں بھلا
اسکے پیچھے ایسی پنجے جھاڑکر تو پڑ گئی — حال پر اسکے ہیں سب انگشت حیرت در دہاں

طاقت

میری کیا مجال کہ کسیکو نفع یا نقصان پہنچا سکوں بلکہ مجھکو ارادہ نے مجبور رکھا ہے۔ میں ارادہ انسانی کا اتباع کیا ہے۔ یہ سوال ارادہ سے ہو۔

طاقت

یہ اکیا مقدور جو ہل بھی سکوں میں خود بخود — ہاں ارادہ نے کیا مجبور مجھکو مہرباں
عزم انسانی کی تابع رہتی ہوں آٹھوں پہر — آپ ارادہ کو طلب کر آج کیجے بیاں

صاحبدل

اے ارادے! تو نے طاقت کو کیوں ابھارا کہ اس نے ہاتھ پر ہاتھ نے قلم پر ظلم کیا۔

صاحبدل

اے ارادے! تو نے طاقت کو ابھارا کس لئے — بیٹھے بیٹھے تیرے فتنوں نے اٹھایا آسماں

...تو ہاتھ پہ اور ہاتھ نہیں تا قلم ہم کہیں کیونکر نہ تجھکو ہاتھ طرز نہاں

اُرادہ

...سے رہے کی بجائے دل سے . بغیر دل کی تحریک کے میں کچھ نہیں کر سکتا . دل سے پوچھو۔

ارادہ

...سے منے کی تجوریت بارگاہِ قلب میں منقلب ہیں انقلابِ دل سے تو موسلیاں

...دل سے پوچھئے . بیدل کیجیا مجھے ہر ہوں بے تقصیر ہو اسپر ہی منتج گریں

تماجمل

...ہ دل تو نے ارادے کو قلم کاٹنے پر یوں مجبور کیا . تو رئیس الاعضا ہو امیروں میں انصاف

...نے ہیں . نذر ظلو۔

صاجمل

...ہے سے قلب بشر . اعضا میں اک عضو سُر ہو کے عالیجاہ تو نے کیا کیا یہ ناگہاں

...تے ہیں اہل سیاست معدلت گستر مت پر ترا شیوہ رعیت کو جو ایذا رساں

قلب

...سیر القلب ! تجھے معلوم نہیں کہ میں قلب ہوں . مگر تقلب القلوب کوئی اور ہے سہ

اہل دل را خدا ے بخشندہ داد بود از کرم زبانِ مقال

...برکرم صد کرم زیادت کرد داد او را خمیرِ لسانِ الحال

دل

...سیر القلب : گو کہتے ہیں مجھکو قلب سب ہے مقلب میرا لیکن اور ہی کوئی نہاں

...ہوں ہی آنکھوں میں بس اسکو سمجھ لیجے حضور چھپکے ہی چھپکے اسے پہچان لیجے مہرباں

...دل کی ہے . لے دل ہی دل میں رہنے دیجئے آ گئے عرضِ حال کی حد میں تمنائیں ان

...زبانِ حال کی کچھ مختصر سی گفتگو بات بڑھتے بڑھتے پہنچی ہے کہاں اب کہاں

عبد القدوس قدسی

ریویوز

جناب مولوی عبد اللہ خاں صاحب سابق سیکنڈ ماسٹر سنٹرل ماڈل سکول لاہور حال ممبر ڈیپارٹمنٹ ٹیکسٹ بک ریویژن کمیٹی لاہور اس بات پر از حد خواں حصہ آبادی کی طرف سے خاص تحسین و شکرگزاری کے مستحق ہیں کہ اپنی فرصت کا وقت انہوں نے ایسی کتابوں کی تالیف و اشاعت میں صرف کیا ہے جو تعلیم کے مختلف مضامین پر مشتمل اور بچوں کے لیے بہت کچھ کارآمد و عجیب ہیں۔ حال میں ماسٹر صاحب موصوف نے یہی چند کتابیں غرض ملاحظہ دفتر مخزن میں ارسال کی ہیں۔ ان میں سے (۱) **حساب کا قاعدہ** ہے جس میں ایک سے سو تک گنتی سمجھنے اور ہندسے لکھنے اور پڑھنے کا ایسا سہل طریق بتایا گیا ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر کے بچے تمام اعداد اور اُنکے اجزائے ترکیبی کو بخوبی ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ ہر عدد کے ساتھ جمع تفریق ضرب و تقسیم کے آسان و ضروری عمل بھی درج کیے گئے ہیں اور بڑے بڑے نقطوں اور مربع خانوں کے نقشے دیے گئے ہیں تاکہ بچے ہر ایک ہندسے کی مقررہ مقدار کو ہر پہلو سے سمجھ سکیں اور حساب کے ابتدائی و بنیادی اصولوں میں کبھی غلطی نہ کریں۔ اس قاعدہ حساب کی ضخامت مع سرورق و دیباچہ وغیرہ تین جزو ہے قیمت ۲ر (۲) **عجیب و غریب لطیفے حصہ اول**۔ اس میں بچوں کی تفریح طبع کے لیے ۵۴ دلچسپ لطیفے مندرج ہیں۔ لطیفے اکثر وہی ہیں جو عام زبانوں پر مذکور ہیں مگر ان کے جمع کرنے میں اس امر کی پوری احتیاط رکھی گئی ہے کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا کنایہ ایسا نہ آنے پائے جس سے معصوم بچوں کا ذہن کسی منافی اخلاق یا خلاف تہذیب بات کی طرف منتقل ہونے کا اندیشہ ہو۔ عبارت بھی سلیس و آسان ہے۔ تقطیع، لکھائی چھپائی سب بچوں کے لیے موزوں اور قیمت صرف ایک آنہ (۳) **حکایات عجیب**۔ ۲۹ دلچسپ و نتیجہ خیز حکایات پر مشتمل ہے جن میں اکثر اردو منثور اور معدودے چند عربی و انگریزی سے لی گئی ہیں۔ سوائے دو چار کے باقی تمام حکایتیں ایسی ہیں جنہیں پڑھ کر دماغ کو فرحت پہنچتی اور لبوں پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ دیباچہ میں تالیف کتاب کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "جو طالب علم اسکول میں اکثر اردو ریڈر ہی کا فائدہ بھی حاصل ہو اور طبیعت بھی اکتا... باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف ۲ر مقرر ہے +

ترانۂ مسرت

یعنی

آمدِ اقبال

اقبال کا ولایت سے بخیریت واپس آنا اہلِ ادب اور اہلِ سخن کے لیے کوئی معمولی خوشی کی بات نہیں کیونکہ یہی ایک شخص ہے جس کے دم سے اُردو زبان کی شعر و عظمت اور نیچرل شاعری کی تمام امیدیں آج وابستہ ہیں۔ اِن کے واپس تشریف لانے سے اہلِ علم و اربابِ ذوق اور حلقۂ سخن میں ایک خاص مسرت پھیلی ہوئی ہے اگرچہ میرا زمانہ دنیا کے دھندوں میں اس قدر گھر گیا تھا کہ شغلِ سخن سے قطعی محروم ہو گیا مگر اقبال کی آمد کی خوشی نے انبالہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں مندرجہ ذیل چند سطریں لکھوا ہی لیں۔ یہ چند سطریں ۲۶۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ مقام دہلی ایک ایسی بزم میں پڑھی گئیں جس میں اقبال کے شمع کمال کے چند پروانے جمع تھے۔ اور جس دن بھر اقبال کی آمد کی خوشی میں بمکان ورثائی حضرت خواجہ سید حسن نظامی صاحب مد فیضہ معتمد توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی بزمِ احباب منعقد ہوئی۔ اس بزم کے حاضرین میں سے خواجہ صاحب موصوف شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا۔ شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ ایڈیٹر مخزن۔ مولوی محمد عبدالراشد صاحب خیری۔ سید جالب صاحب دہلوی خصوصیت سے

پھر بہار آئی یہ گلشنِ سخن میں — اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مسرت آئی ہے جب چمن میں — پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
رنگ سبز ہو شوخ جھٹ پٹ رنگا رنگ لو — عطرِ عروسِ گل ہو پھولوں کے پیرہن میں

ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی — نرگس لگائے سرمہ چشمانِ کم سخن میں
غنچوں کو حکم دیدو دیں دادِ کج کلاہی — تیکھی ادائیں نکلیں سوسن نسترن میں
ہر غنچہ مسکرائے ہر پھول کھلکھلائے — ہر برگ لہلہائے رونق ہے جو چمن میں
ہو اہتمام ایسا آرائشِ چمن کا — باقی رہے نہ دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں
سروِ سہی سے کہدو ناچے ذرا لبِ جو — قمری ترانہ گائے جلسہ ہے یہ چمن میں
یوروپ کی سیر کرکے **اقبال** واپس آئے — خوشیاں منائیں ملکر اہلِ وطن وطن میں
ہے آمد مسرت **اقبال** تیری آمد — خوشیاں ہیں اہلِ دل میں شیدیں ہیں اہلِ فن میں
آنکھوں پر بٹھایا یوروپ میں تجکو سب نے — غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہونگے تازہ سخن کے چرچے — پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

جزیرہ سسلی

ہمارے نہایت پیارے دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا خیر و خوبی سے بہزار کامیابی ولایت سے واپس آئے۔ اور آتے ہوئے مخزن اور قدردانانِ مخزن کے لیے ایک قابل قدر تحفہ لائے۔ جزیرہ سسلی روئے زمین کے اُن حصوں میں سے ہے جہاں اہل عرب نے اپنی فتوحات کا جھنڈا بلند کیا اور اپنی تہذیب کی روشنی پھیلائی۔ اور جو انقلاب دوراں کے ہاتھوں اب اس حالت میں ہے کہ تاریخ داں لوگوں کے سوا اور کسی کو اس میں اسلام کی عظمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ ہمارے دوست فرماتے ہیں کہ وہ رات کے وقت جہاز میں اس جزیرہ کے پاس سے گزرے اور اسکی روشنیوں کو دیکھکر بعض خیالات اور جذبات نے یکایک اُن کی طبیعت پر ہجوم کیا۔ یہ نالۂ موزوں اُن ہی خیالات اور جذبات کا نتیجہ ہے +

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار — وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے — شعلۂ جانسوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے
آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل — جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل
زندگی دنیا کو جن کی شورش قم سے ملی — مخلصی انساں کو زنجیر توہم سے ملی

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو — رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے — تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام — موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر — داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی — ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں — تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں — جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے — قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لیجاؤنگا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤنگا

اقبال

مقدم برشگال

آہ! اے ساون کے جھالو! اے فضائے برشگال — آہ! اے سحر کے نالو! اے ہوائے برشگال
اودے اودے بادلو! آغوشِ رحمت کی قسم — تھے کہاں اگلے برس تم جوشِ رحمت کی قسم
تیرے اشکوں کا کہاں تھا ابرِ گریاں سلسلہ — آنسوؤں کا خلق کے تھا تا بداماں سلسلہ
یوں نہ اُڑتے تھے ہوا میں ٹکڑے ابرِ سیاہ — تھی زمانے کیلئے بارانِ رحمت! تیری چاہ
سبزۂ صحرا میں یہ شانِ دل آویزی نہ تھی — جوشِ بارانِ کرم میں یہ گہر ریزی نہ تھی
لالہ و گل سے تھی خالی موجِ آغوشِ زمیں — یوں نہ تھیں پھولوں کی بیلیں [illegible] زمیں
لاجوردی تھیں نہ سبزے سے زمیں کی ڈھیریاں — نیلگوں تھیں خیمۂ عرشِ بریں کی ڈوریاں
جوش پر آئی ہوئی ساون کی اودی کالی گھٹا — تو کہاں تھی لمبے لمبے گیسوؤں والی گھٹا
تیری جھڑیاں تھیں کہاں اے ابرِ بارانِ کرم — خلق تھی تشنہ لبِ سرچشمۂ نیسانِ کرم
تجھ کو اے ابرِ سیہ! اشکِ باراں کی قسم — نالہائے خلق کے دودِ پریشاں کی قسم
اے بہارِ عالمِ نیرنگِ پہنائے زمیں — تو کہاں اتنے دنوں سے تو! تھا خلوت نشیں
تیری جھڑیوں کی ضرورت آہ! دہقانوں کو تھی — پیاس تیرے شوق کی سوکھے ہوئے دھانوں کو تھی
تکتے تھے راہ تیری سرو و ریحانِ چمن — تیرے مقدم کے تمنائی تھے مرغانِ چمن
لب پہ قمری کے صدائے نغمۂ دلجو نہ تھی — کنگرہ پر فاختہ کی صبح دم کوکو نہ تھی
بزمِ قدرت میں نہ تھی رعنائیِ رنگِ نشاط — بے صدا تھا تیرے غم میں سازِ آہنگِ نشاط
کھیلتی کالی گھٹا یوں سبزہ زاروں میں نہ تھی — آہ! یہ عالم فریبی آبشاروں میں نہ تھی
فتنہ فتنہ آہ! وقفِ بارشِ خوں ناب تھا — قطرہ قطرہ آہ! تیرا گوہرِ نایاب تھا
قحط کا بارِ گراں تھا بارِ عصیاں دوش پر — بارے آیا، شکر ہے، دریائے رحمت جوش پر

...ہانی رُت تمی اے ابرِ باراں آگئی ٹھنڈی ٹھنڈی مینہ کی پھر لیکے جھڑیاں آگئی
...ری پھر ٹوٹنے دہقانوں کے ارمانوں میں جان پڑگئی قسمت کے پھر زرخیز میدانوں میں جان
...لی تمی شدتِ امساکِ باراں سے مُحال تیرے آنے سے ہوئی ابرِ کرم! خلقت نہال
...کالیں کونپلیں۔ پھر روپ پر آئے شجر پھر چمن کا رنگ بدلا۔ پھر نکھر آئے شجر
...اسے دل ادائے سبزۂ کہسار پر کر دیا قدرت نے مینا وادیِ پُرخار پر

لاکھ جانیں تیرے صدقے! ابرِ نیسانِ کرم
ڈال دی مٹی میں تُو نے جان بارانِ کرم

سرور جہان آبادی

برسات سرور جہان آبادی

برسات

غربت میں اب کے آئے ہیں پھر دن بہار کے قدرت نے پھینکا جامۂ کہنہ اُتار کے
پھر رنگ ڈھنگ بدلے ہیں لیل و نہار کے پھر آئے دن بہار کے اور پھر نکھار کے
صحرا و باغ و راغ کے مقسوم کھل گئے اب لطف دیکھنا کوئی دن میں کچھار کے
دشت و جبل میں فرشِ زمرد ہوا تمام منظر عجیب ہو گئے قرب و جوار کے
جوبن پہ ان دنوں ہے عروسِ چمن کا رنگ قرباں ہیں آن بان کے اور اس سنگار کے
صحنِ چمن سے اب اُٹھنے کو جی نہیں ہونگے یہیں نشان ہمارے مزار کے
کوئل کی کو کو اور پپیہے کی پی کہاں! نالے سُنائی دینے لگے پھر ہزار کے
کس درجہ دلفریب ہے طاؤس کی صدا جنگل تمام سر پہ اُٹھایا پکار کے
چمکی گھٹا میں بجلی تو جی لوٹ ہو گیا انداز یاد آئے کسی گلعذار کے
فصلِ بہار آتے ہی فرقت ہوئی نصیب دن تھے یہی تو لطف کے ملنے کے یار کے
...د شاد کام ہستیِ ناپائدارِ زیست ہم دل جلوں سے پوچھ مزے اس بہار کے

ناکام آرزو ہوں میں حرماں نصیب ہوں — مضطرب ہے جلا مجھے نغمے ملار کے
برباد گر کیا ہے فلک نے تو یہ بھی ہو — مٹتا نہیں دل سے نقش محبت کے پیار کے
ناشاد غم نے زیست سے بیزار کر دیا — اب ہم ہیں اور قدم شہ دُلدل سوار کے

ناشاد

عالمِ نزع

نزع کا حال نہ پوچھ اے ہمدم — کیا بتاؤں کہ ہے کیسا عالم
ہوتی جاتی ہے جہاں سے دُوری — اُف رے بے بے کسی و مجبوری
بے وفا روح یہ کیا تجھ کو ہوا — عمر بھر کا تھا سہارا ساتھ ترا
آن سختی ہے یہ مجھ سے تیری — ٹوٹی جاتی ہے ہر اک رگ میری
ختم ہیں طولِ اَمل کی باتیں — اب نہ وہ دن ہیں نہ ہیں وہ راتیں
آج ہوتی ہے وداعِ مہماں — روح کرتی ہے سفر کا ساماں
جھلملاتا ہے چراغ دنیا — اب سیئے جاتا ہوں داغ دنیا
فاش ہوتا ہے یہ رازِ ہستی — بے صدا ہوتا ہے سازِ ہستی
ہو گیا آئینہ حالِ دنیا — آج سُوجھا ہے مآلِ دنیا
وقت اب وہ ہے کہ مختل ہیں حواس — عقل بے کار معطل ہیں حواس
ہے نگاہوں کی عجب کیفیت — کس قیامت کی بھری ہے حسرت
شکل موہوم ہے یہ دارِ خراب — سب طلسمات جہاں نقش بر آب
سیمیا ہے یہ نمودِ دنیا — شعبدا ہے یہ نمودِ دنیا
عبرت آگیں ہے بہارِ ہستی — کیا ہے یہ نقش و نگارِ ہستی
قصرِ رفیع نہ طلائی ایواں — کیا بتاؤں کہ یہ کیسا تھا سماں

چاندنی ہے نہ وہ حسرتِ دل کی ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ ہوا ہے نہ وہ فرحت دل کی
نہ وہ گلگشت رہی اور نہ چمن ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ بلبل ہے نہ وہ بوئے سمن
نہ شجر ہیں نہ گلِ تازہ و تر ‌‌ ‌‌ ‌‌ نخلِ تابوت ہے اب پیشِ نظر
نہ وہ نہریں ہیں نہ وہ فوارے ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ فلک ہے نہ فلک پر تارے
نہ وہ سیارہ و ثوابت کا نظام ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ گردش نہ وہ دورِ ایام
نہ عناصر کا زمانے میں پتا ‌‌ ‌‌ ‌‌ آب و آتش ہے نہ ہے خاک و ہوا
نہ ہے حیوان کوئی اور نہ زمیں ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ جمادات و نباتات کہیں
اب کہاں نفسِ نباتی کا اثر ‌‌ ‌‌ ‌‌ اب کہاں نامیہ اور برگ و ثمر
مہر و مہ ہیں نہ بروجِ افلاک ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ ذرے ہیں نہ وہ طبقۂ خاک
نہ وہ لشکر نہ حصارِ سنگیں ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ عمارات نہ وہ حصنِ حصیں
نہ اقالیم نہ ربعِ مسکوں ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ یمن رہی نہ آبِ جیحوں
ہفت جوش اب نہ معادن ہیں کہیں ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ فلزات و جواہر ہیں کہیں
نہ وہ دریا ہیں نہ وہ دشت و جبال ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ فصلیں ہیں نہ ہیں مہ و سال
نہ وہ صحرا ہے پر از ہول و خطر ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ ہے وہ ذوق تماشائے نظر
وہ فضا ہے نہ وہ چٹیل میدان ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ مناظر ہیں نہ ہیں وہ سامان
روشیں ہیں نہ ہیں اب وہ گلزار ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ گنجان درختوں کی بہار
نہ وہ دل ہے نہ تماشا طلبی ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ ہے سبزہ نہ وہ مخبرِ نسبی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ اسبابِ نشاط ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ محفل ہے نہ اربابِ نشاط
نہ کلیسا ہے نہ بت خانہ ہے ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ کہیں محفلِ رندانہ ہے
ب نہ وہ عشق رباب کماں ‌‌ ‌‌ ‌‌ نہ وہ صوفی ہیں نہ وہ صحبتِ حال
حافظہ ہے نہ تصور ہے کہیں ‌‌ ‌‌ ‌‌ واہمہ ہے نہ تخیل ہے کہیں

ہجر ہے اب نہ وہ فرہاد کا غل — رات ہے اور نہ خیالِ کاکل
نہ وہ کس بل ہے نہ وہ زورِ شباب — عشق ہے اور نہ دلِ خانہ خراب
اب نہ پہلو میں بتِ نو آئیں — اب نہ وہ شب ہے نہ خواب نوشیں
جستجوئے دلِ گم گشتہ کہاں — اب نہ میں خود ہوں نہ اس دل کا نشاں
زندگی تک تھی مری شانِ وفا — اب وفا ہے نہ وہ پیمانِ وفا
نہ خیال اب دلِ سودائی کا — نہ میں قائل ہوں مسیحائی کا
کوچہ گردی ہے نہ وہ جوشِ جنوں — اب نہ رگ رگ میں ہے وہ گردشِ خوں
ہوں نہ خمیازہ کشِ لذتِ دید — نہ سمجھتا ہوں میں نظارۂ عید
دل جو اک وحشیِ رم خوردہ تھا — کیا عجب پاس ہمارے ہوگا
میں کہاں اور کہاں طولِ امل — اب تو ہے فکرِ مکافاتِ عمل
اپنی حالت پہ میں روؤں کیونکر — اپنی غفلت پہ میں روؤں کیونکر
میں ہوں اور عاقبتِ کار کی فکر — گوشۂ تاریکِ لحد کے ہیں ذکر
دیکھیے دیکھیے ہے کیا ہونا — ہے مجھے جان کا اپنی رونا

کچھ یونہی سا مجھے آتا تھا نظر
دیکھتا تھا یہ طلسمی منظر

دفعتہً نور ہوا سب زائل — اک حجاب آکے ہوا ہے حائل
سب یہ نقشہ مری آنکھوں سے چھپا — پردۂ عالمِ تصویر اٹھا
ہیچ تھے ہیچ تھے سب یہ ساماں — ہم نہیں جب تو ہے کیا خاک جہاں
دیکھ لو دیکھنے والو صورت — آج تو میں ہمہ تن ہوں عبرت
محفلِ عیش ہے درہم برہم — اب ہے آرایشِ بزمِ ماتم
گھیرے بیٹھے ہیں احبا سارے — روتے جاتے ہیں اعزا سارے

اب دعاؤں کی فراوانی ہے — مشغلہ سب کا مگس رانی ہے
دیکھتے جاتے ہیں صورت میری — زیر تجویز ہے تربت میری
شور گریہ مرے سر پہ ہے بپا — ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا
غور سے دیکھ ذرا اے غافل — زور تدبیر یہیں سے باطل
سر بالیں ہے ہجوم حسرت — دم بخود چارہ گروں کی صحبت
ہیں اسی فکر میں احباب اکثر — ڈوبیں نبضیں مری ابھریں کیونکر
کھولا جاتا ہے وصیت نامہ — کوئی لکھتا ہے شہادت نامہ
فکر کافور و کفن میں کوئی — نالہ کش بیت حزن میں کوئی
کوئی کہتا ہے بصد آہ و فغاں — اسکی مشکل ہو الٰہی آساں
روح کا قول ہے یہ وقت اخیر — خواب ہستی کی یہی ہے تعبیر
پوچھتے کیا ہو مرا حال خراب — میں ہوں اور داغ فراق احباب
سر بالیں ہے مرے اک صحبت — دیکھوں کس طرح میں سب کی صورت
نور تھا آنکھ میں اب وہ بھی نہیں — زلف آراستہ کھلتی ہے کہیں
کہہ دو زلفوں کو نہ کھولیں للہ — میری نظروں میں زمانہ ہے سیاہ
شرح بے ربطی الفاظ سے ہوں — اب نگاہوں سے مری کرے قیاس
دامن اشکوں سے بھگونیوالے — اے مرے حال پہ رونیوالے
کیا کیا میں نے بتاؤں کیونکر — سرگزشت اپنی سناؤں کیونکر

قوت نطق گئی سب میری
بند ہوتی ہے زباں اب میری

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

تازہ غزلیں

دخل ہے ہر دل میں اب تک دقِ غم پیچیدہ ہے
بُلبلا ہے عین دریا میں گہر نم دیدہ ہے

دیجیے کس چیز سے تشبیہ تیرے حسن کو
ایک تو ہی دیدہ ہے تیرے سوا نادیدہ ہے

بے حجابی یہ کہ ہر صورت میں جلوہ آشکار
گھونگھٹ اُس پر یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

فتنہ زارِ حشر سب سمجھے تھے تیرے حسن کو
دامنِ تارِ نگہ کا گوشہ جنبیدہ ہے

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

آسی

مانا تمام خلق سے تو بے نیاز ہے
تیرا نیاز مند ہوں یہ مجکو ناز ہے

اٹھ جائے بزمِ مے سے جو بے امتیاز ہے
خلوت پسند صحبتِ افشائے راز ہے

تیرے فقیر دولتِ طاعت سے ہیں غنی
داغِ سجود درہمِ اہلِ نماز ہے

شاید یہ نردبان ہو بامِ وصال کا
عالم تمام کوہِ نشیب و فراز ہے

سرمایۂ غنا ہے ترقی احتیاج
جو فقر میں فنا ہو وہی بے نیاز ہے

وہ محوِ رنگ خندہ ہے یہ محوِ ذاتِ گل
بلبل میں اور غنچہ میں یہ امتیاز ہے

کیوں سدِ راہِ میکدہ ہوتا ہے محتسب
پوچھو کہ بند ہے کہ درِ توبہ باز ہے

تکلیف ہے وطن میں زیادہ سفر میں کم
نکلو تو عینِ راہ میں قصرِ نماز ہے

قائل ہے نیک و بد میں تجلّیِ حسن کا
کاشف کی کیا سند کہ وہ بے امتیاز ہے

کاشف غازیپوری

رکھنا خمِ گیسو میں یا دل کو رہا کرنا
کچھ کہہ تو سہی ظالم آخر تجھے کیا کرنا

آتا ہے سوا اس کے اور تجکو کیا کرنا
اپنوں کو بُرا کہنا غیروں کا بھلا کرنا

مجھ سے ہی جدا رہنا مجکو ہی جدا کرنا
پھر اُس پہ یہ طرّہ ہے میرا ہی گلا کرنا

اب قتل مجھے کرنا یا عفو خطا کرنا — منظور جو کرنا ہو پھر سوچ کے کیا کرنا

آئینہ میں عکس اپنا دیکھا تو کہا مجھ سے — مطلب [illegible]

بوسہ بھی مجھے دینا ہونٹوں میں کبھی کہنا — جھڑکی بھی [illegible] مرنے کی دعا کرنا

دل تو نہ مرا توڑو وعدہ تو ذرا کر لو — چاہو تو وفا کرنا چاہو نہ وفا کرنا

کیوں ہم سے ہے [illegible] غرض تمکو — مجھ پر ہی ستم ڈھانا مجھ سے ہی دغا کرنا

ہم بھی تو کبھی تھے جب ہم سے بھی پیماں تھے — یوں ملکے وفا [illegible] کرنا

کیا مجھ سے زیادہ ہے پابند وفا کوئی — ایمان سے تم کہدو انصاف ذرا کرنا

جلتے ہو جو گھر جاؤ پردہ یہ کر جاؤ — میں یاد جب آ جاؤں [illegible]

ہے غیر کے ہاتھ میں [illegible] — اب مجھ پہ کرم کرنا اب مجھ سے [illegible]

[illegible] کے یہ ملنا کیا دل کے [illegible] — کیوں کہہ کے نہیں کہتے [illegible]

وہ ہم جو کھنچ بیٹھے قسمت کی [illegible] — بیکار ہے غم کھانا [illegible]

انکو بھی ادھر ہے ہٹ پامال کریں ہمکو — دل کو [illegible]

میں منہ کہ مجھے شکل [illegible] — [illegible]

تم بھی تو سنی چتونیں لاکھوں ہی گئیں بل — ہے ترک ترا ناوک کیا [illegible] خطا کرنا

دل ہمکو تو نہیں دینگے کیا عہد وفا [illegible] — تم جور و جفا کرنا ہم مہر و وفا کرنا

ہے وصل کی شب ہمکو افسوس [illegible] — [illegible]

صیاد مرا سب چمن میں [illegible] — [illegible]

یاں عہد وفا ہوگا یا حشر پہ [illegible] — [illegible]

[illegible] دل کا [illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

میمیرے کا سُرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت۔ تاریکی چشم۔ دھند جالا۔ پڑوال۔ غبار۔ پھولا۔ ٹیل سُرخی۔ ابتدائی موتیابند ناخنہ۔ پانی جانا۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر او حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں۔ چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ بچہ سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے۔ قیمت اس لئے کم رکھی ہے کہ خاص و عام اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے (عہ) میمیرے کا سفید سُرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ (مے) خالص میمیرہ فی ماشہ عسہ مصری سرمہ فی تولہ ۴ر خرچ ڈاک ذمہ خریدار۔ درخواست کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ **المشتہر** پروفیسر سیلسنگھ اہلوالیہ مقام بارہ ...

اِن سے بڑھ کر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میمیرے کا سرمہ جو سردار سیلسنگھ اہلوالیہ نے ایجاد کیا ہے۔ بڑی بیش قیمت اور مفید دوا ہے بالخصوص مفصلہ ذیل امراض کیلئے بمنزلہ اکسیر ہے آنکھوں سے پانی بہنا۔ جلنا۔ دھند۔ سوزش۔ ہر قسم جسکو نزلہ آنا کہتے ہیں۔ چشم و کمزوری نظر۔ ناخنہ۔ بیرا اور اندر کی جھلی کا زخم اور ان سے پیدا ہوا۔ چونکہ اس سرمہ میں کوئی ... شے نہیں ہے۔ اس لئے ہر کسی کے لئے اسکا استعمال مفید ہے مفصلات میں جہاں لائق ڈاکٹروں کا ملنا محال ہے ... ایسی مفید دوا کو ضرور پاس رکھنا چاہئے۔ ...

بلا شک و شبہ کہہ دیتا ہوں کہ مذکورہ بالا امراض کیلئے میمیرے کا سرمہ ضرور ہی مفید ہے۔ راقم ڈاکٹر ایم۔ بی ساگلی ... ایم۔ ڈی ایم ایس سند یافتہ یونیورسٹی ایڈنبرگ انگلینڈ ...

(۲) جناب سردار صاحب! تسلیم میں نے آپکا میمیرے کا سرمہ استعمال کیا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ بیشک یہ سرمہ کمزوری چشم کو بہت مفید ہے میری آنکھیں ... کمزور تھیں۔ لگاتار ایک پہر کام کرنے سے معذور ہو جاتا تھا۔ اب میری کیفیت ہے کہ صرف ۴ روز کے استعمال سے تین تین پہر بلکہ تمام اچھی طرح کام کر سکتا ہوں۔ راقم میاں خورشید محمد خان ...

پانچ ہزار روپیہ انعام اگر کوئی شخص میمیرے کے سرمہ کی سندات میں جو قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے اسکو ملغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ بمراہ ہو کے بنک میں اسی مطلب کے لئے مارچ سنہ ۱۹۰۲ء سے جمع کیا گیا ہے۔

مخزن

رنگ و بیرنگی

دنیا میں جتنے رنگ ہیں سب کا ظہور روشنی پر موقوف ہے۔ جتنے زور کی روشنی ہوگی اتنا ہی صاف ہر چیز کا رنگ نظر آئیگا۔ مدھم روشنی میں رنگ بھی ماند معلوم ہوتا ہے اور اندھیرے میں تو نیلا لال زرد کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اس مناسبت سے خیال گذرتا ہے کہ رنگ کو روشنی سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے۔ کسی بنکرے کے سامنے یہ گفتگو ہو تو چھوٹتے ہی کہیگا "میاں اندھیرے میں تو آدمی کو قلعہ نہیں سوجھتا تم رنگ کو لئے پھرتے ہو" لیکن اگر دنیا میں سب ایسے ہی آزاد اور عقل کے دشمن پیدا ہوتے تو خدا کی خدائی کبھی ایسی آباد نہ ہوتی۔ کارساز عالم نے دنیا کا انتظام ایسے اصول پر رکھا ہے کہ سرسری نگاہ سے دیکھئے تو ہر بات معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جتنا عقل کو دخل دیجے بات میں سے بات نکلتی آتی ہے یہانتک کہ رفتہ رفتہ بات کا دفتر بن جاتا ہے۔ ذراسی مشابہت یا مخالفت دو چیزوں میں ہونی شرط ہے پھر اس میں جتنی غور و فکر کی جائے تھوڑی ہے جس قدر جس [illegible] کی رسائی ہے قدرت کے کرشمے اسی قدر اس کو نظر

نے لگتے ہیں۔ فلسفہ طبیعیات کے عالموں نے صدہا عملی و نظری دلائل سے پایۂ ثبوت کو پہونچایا ہے کہ رنگ کوئی مادّی شے نہیں بلکہ خود روشنی کا جزو ہے۔ طبیعیات کی کتابوں میں لائیٹ یعنی ضیا یا روشنی کے نام سے ایک باب الگ ہی ہوتا ہے بلکہ اکثر محققین نے کتابیں کی کتابیں اسی مضمون سے پر کر دی ہیں یہاں روشنی کے چند خواص نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔

کسی روشن چیز کی طرف دیکھیے تو اُس میں سے باریک باریک روشنی کے خط جھاڑو کی تیلیوں کی طرح نکلتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان خطوں کو شعاع یا کرن کہتے ہیں۔ ایک چیز کی روشنی دوسری چیزوں پر ان شعاعوں ہی کے ذریعے سے پہونچتی ہے۔ شعاعیں جب کسی شے پر پڑتی ہیں تو کچھ اُس پر سے منعکس ہو کر دوسری چیزوں پر چلی جاتی ہیں کچھ اُسی شے کے اندر جذب ہو جاتی ہیں کچھ اُس کی سطح بیرونی پر پھیل کے رہ جاتی ہیں اور اگر وہ شے لطیف و شفاف ہے تو کچھ شعاعیں پار بھی نکل جاتی ہیں اس تقسیم سے باری تعالیٰ کی ظاہری مصلحتیں یہ ہیں۔

۱۔ جہاں روشنی براہ راست نہیں پہنچ سکتی وہاں بھی خاصا اُجالا ہوتا ہے اگر آفتاب کی شعاعیں منعکس ہو کے نہ پہنچیں تو کمرے دالان سائبان میں دن کے وقت بھی اندھیر اگھُپ ہوا کرے +

۲۔ اگر جذب نہ ہوں تو کوئی چیز بغیر آگ کے اندر رکھے گرم ہی نہ ہو اور وہ بھی فقط بیرونی سطح۔ گلنا جلنا۔ پکنا۔ پگھلنا کچھ بھی نہ ہو۔ نہ بخارات نہیں نہ مینہہ برسے۔ جو چیز ایک دفعہ تر ہو جائے وہ کبھی خشک ہونے کا نام نہ لے۔ بارہ مہینے جاڑا ہی رہے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں کو

آگ سے بھی خاک اثر نہ ہو۔

۳۔ اگر سب شعاعیں جذب یا منعکس ہو جائیں اور سطح پر کچھ بھی نہ قائم رہیں تو واقعی دن کو قلعہ نہ دکھائی دے۔ بازار سب پٹ پڑے رہیں اور رستے میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے۔

۴۔ اگر صاف شئے میں سے شعاعیں پار نہ نکلیں تو سب لالٹین جھاڑ فانوس سب بیکار۔ کمرے کے کواڑ الماری روشندان وغیرہ میں بھولے سے کوئی شیشے نہ لگائے اول تو آفتاب کی روشنی زمین تک پہونچنے ہی کیوں لگی زمین کے اوپر چالیس پچاس میل کے دل کا خول ہوا اور بخارات وغیرہ کا چڑھا ہوا ہے +

یہ چند خاصیتیں جو ابھی بیان کی گئیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ نہ آلات کی ضرورت نہ علم کیمیا و طبیعیات کی کچھ ایسی واقفیت درکار ہے بعض خواص ایسے ہیں کہ بغیر کسی مدد اور ذریعے کے نہیں معلوم ہو سکتے۔

کبھی دیکھا ہوگا بچے جو صابن کے بلبلے اُٹھاتے ہیں اُن میں طرح طرح کے رنگ معلوم ہوتے ہیں حالانکہ صابن سفید پانی سفید شیشے کے ٹکڑے میں بھی اسی طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ گھر میں پڑی پڑائی کہیں جھاڑ کی قلم مل جائے تو اُس میں سے دھوپ کی طرف دیکھیے۔ سات رنگ (لال۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ آبی۔ نیلا۔ بنفشئی) صاف دکھائی دینگے آخر یہ رنگ کہاں سے آئے شیشہ اپنی ذات سے سفید۔ اندر سے ٹھوس۔ نہ رنگ بھرا ہوا نہ پیپر ویٹ[۱] کی طرح بیچ میں تہ دی ہوئی۔ آس پاس کھونٹی الگنی پر رنگ

---

[۱]۔ پیپر ویٹ شیشے کا گلدستہ جو کاغذ دبانے کے واسطے رکھا جاتا ہے۔

بے رنگ کے کپڑے نہیں پڑے ہوئے نہ طاقوں میں گلدستے چنے ہوئے۔ جس چیز کے عکس کا شبہ ہو اُسے ہٹوا دیجئے پھر دیکھیے تو وہی ساتوں رنگ اور وہی ترتیب۔ قلم پر شبہ ہو تو توڑ کے دیکھ لیجیے وہی رنگ اپنی اپنی جگہ پر ہر ٹکڑے میں نظر آئینگے۔ آخر یہ طلسمات کیا ہے۔

اہلِ علم نے بچوں کے کھلونوں سے ایک بات پا کر غور کرنا شروع کیا۔ ہر پہلو سے دیکھا طرح طرح کے آلات سے تجربہ کیا آخر یہ بات نکلی کہ یہی دھوپ جو بظاہر سفید اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے سات رنگ کی شعاعوں سے مرکب ہے۔ رہی یہ بات کہ شیشے کے ذریعے سے رنگ دکھائی دیتے ہیں یوں کیوں نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے واسطے ایک اور مسئلہ حل کرنے کی ضرورت ہے جسمیں انحراف شعاع کی بحث ہے۔ فی الحال یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ منشور مثلث یعنی تکونے شیشے میں داخل ہو کر ایک ایک رنگ کی شعاعیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

سفیدی میں سب رنگ شامل ہیں اس کی جانچ ایک اور طریقے سے ہو سکتی ہے جس کو عملِ معکوس کہتے ہیں۔ وہی بچوں کے کھلونوں میں سے ایک پھرکی لے لیجیے اور اُس کا رہا سہا رنگ بھی چاقو سے کھرچ کے پانی میں بھگو کے چھٹا دیجیے پھر اُس کے دور میں اوپر کی طرف سات نقطے ساتوں رنگ کے ایسی ترتیب سے لگا دیجیے جیسی شیشے کی قلم میں نظر آتی ہے۔ اس پھرکی کو پھرانے سے اُن نقطوں کی جگہ ایک لکیر بالکل سفید رنگ کی نظر آئے گی جس کے یہ معنے ہوئے کہ ساتوں رنگ کے ملنے سے سفید رنگ پیدا ہو گیا۔ قلم کے ذریعے سے ثابت ہوا تھا کہ سفید رنگ میں سات رنگ شامل ہیں پھرکی سے یہ ظاہر ہوا کہ وہی سات رنگ ملانے سے

سفید رنگ بن جاتا ہے۔ اب اس کے مان لینے میں کیا توقف ہے کہ جتنے رنگ ہیں سب کی اصلیت سفیدی ہے۔ نہ دریافت طلب ہے کہ ہر شئے کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے یہ کہاں سے آتا ہے اور اس اختلاف کی کیا وجہ ہے۔

محققین کی رائے ہے کہ رنگ کوئی مادی شئے نہیں اور نہ کسی شئے کی ذات میں موجود ہے بلکہ جس رنگ کی شعاعیں سطح پر باقی رہ جاتی ہیں وہی نظر آتی ہیں ان ہی کو اس شئے کا رنگ کہتے ہیں۔ نیلے رنگ کی شعاعیں باقی رہ گئیں تو نیلا رنگ معلوم ہوتا ہے سرخ شعاعیں باقی رہیں تو سرخ رنگ کئی رنگ کی شعاعیں باقی رہیں تو وہ رنگ معلوم ہوتا ہے جو ان کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر کہ کیسی سطح پر کس رنگ کی شعاعیں باقی رہ جاتی ہیں ایک علیحدہ بحث ہے یہاں اسکی گنجائش نہیں۔

غرض رنگ کے متعلق سائنس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ فی نفسہٖ کسی شئے کا کوئی رنگ نہیں۔

۲۔ جتنے رنگ ہیں سب روشنی کی شعاعوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ روشنی کی ذات میں سب رنگ موجود ہیں اور وہ خود سفید یعنی بے رنگ ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر ہے ؎

سارے رنگوں کی ہے بے رنگی میں راہ
ابر گر ہے رنگ بے رنگی ہے ماہ۔

پہلے مصرعے میں ادعا ہے کہ سب رنگوں کی جڑ سفیدی یعنی بیرنگی ہے۔ دوسرے مصرعے میں تمثیل ہے کہ ابر میں ماہ سے رنگ آتا ہے۔

حالانکہ ماہ میں بظاہر کوئی رنگ نہیں۔ چاندنی رات میں ہلکا سا ابر ہوتا ہے تو یہ سماں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بادل کا کوئی ٹکڑا چاند پر آجاتا ہے تو اُس کا رنگ نہایت خوشنما نارنجی معلوم ہوتا ہے اور جب ہٹ جاتا ہے تو وہ رنگ نہیں رہتا۔

رنگ کے عام معنی یہی ہیں "پیلا۔ نیلا۔ زرد۔ کبود" اصطلاحاً کثرت و اقسام کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے۔ الوان نعمت کے معنے ہیں طرح طرح کے کھانے نہ یہ کہ کسی کھانے کا رنگ نیلا ہے تو کسی کا اودا۔ شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا یہاں ہر رنگ کے معنے "ہر حال۔ ہر موقع" ہیں نہ کہ تصویر کی رنگ آمیزی۔ اُردو ہی میں نہیں غالباً ہر زبان میں رنگ کے یہ معنے بھی ہونگے +

تصوف کی اصطلاح میں رنگ سے مراد کائنات ہے اور یہ بھی مناسب کتنی بیشمار صورتیں اور کیسی ایک دوسرے سے الگ ہیں ہر چیز کا نیا رنگ نیا ڈھنگ۔ ع۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست۔ بخلاف اس کے ذات باری تعالیٰ تقسیم و تنوع سے مبرا ہے اُسے ذات بیرنگی کہنا موزوں ہے +

بظاہر یہ اصطلاحیں کثرت و وحدت کے اعتبار سے مقرر کی گئی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن[۱] اور واجب[۲] کا تعلق جیسا ان دو لفظوں سے ادا ہو جاتا ہے۔ دو صفحوں میں بھی بیان نہیں ہو سکتا

۱؎ - ممکن الوجود یعنی مخلوق۔

۲؎ - واجب الوجود یعنی باری تعالیٰ۔

رنگ و ربیرنگی کا لگاؤ جیسا سائنس سے ثابت ہوا ہے کچھ ایسا ہی حساب مخلوق و خالق کا ہے۔ رنگ اور روشنی کا تعلق نظر سے یا منشور مثلث اور پھرکی کے ذریعے سے معلوم ہوجاتا ہے لیکن کائنات اور ذات باری کا تعلق معلوم کرنے کے اور ذریعے ہیں یعنی بجائے نظر کے چشم بصیرت، منشور مثلث کے عوض قلب سلیم اور پھرکی کے بدلے روح مصفا کی ضرورت ہے۔ جن بزرگوں نے ان آلات کو درست کر لیا ہے اور استعمال کرنا سیکھ لیا ہے اُن کو خالق و مخلوق میں وہی تعلق نظر آتا ہے جو ہمیں رنگ اور روشنی میں۔ جو ہمارا قیاس ہے وہ ان کا یقین۔ جو ہمارا تصور ہے وہ اُن کی تصدیق +

اتنا تو ہم بھی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے دالان کی روشنی در و دیوار سے منعکس ہوکر آتی ہے۔ در و دیوار کی روشنی فرش زمین سے۔ زمین کی روشنی آفتاب سے لیکن آفتاب کا فی حد ذاتہ منور ہونا کب ثابت ہے۔ یوں تو ہماری دنیا بھی سیارات کے باشندوں کو روشن معلوم ہوتی ہے مگر یہاں دوپہر کو ذرا سی آندھی آجاتی ہے تو رات ہوجاتی ہے +

سیارات کا نور آفتاب سے آتا ہے تو آفتاب کا نور کہیں اور سے آتا ہوگا۔ خواہ براہ راست یا اور اجرام فلکی سے منعکس ہوکر مختصر یہ کہ نور حقیقی کچھ اور ہی ہے۔ اسی سے زمین و آسمان منور ہیں اور یہ سارا رنگ روپ اسی کا ہے۔ ہمارا سائنس اس کی تحقیقات سے قاصر ہے اسلئے اللہ تعالیٰ خود اس مسئلے کو حل کرکے جامع و مانع الفاظ میں فرماتا ہے۔ "اللہ نور السمٰوات والارض"

اشرف حسین

سودائے سنگین

گذشتہ اشاعت سے آگے

اسی عرصہ میں اُس نے الفرڈ تھیٹر کی ایکٹرسوں میں سے ایک سے دوستی پیدا کر لی، اور اس کے ایک واقعہ کو ایک مہم واقعہ کے طور پر مجھ سے بیان کرنے لگا۔ اس کی عورت سے دوستی ہوئی، مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ اس ایکٹرس کے متعلق ایک دن مجھ سے کہنے لگا "گوہر جان کس قدر بھولی لڑکی ہے، ہرگز خیال میں نہیں آ سکتا کہ کس طرح یہ بھولی بھالی لڑکی اسٹیج پر آ کر شیطانی مسکراہٹ سے، مٹک مٹک کے چمک چمک کے سینہ وا ابھار ابھار کے تمام تماشہ دیکھنے والی خلقت کی حریص نظروں کے سامنے عشوہ فروشی کرتی ہے۔ ایسی بچپن کی سی باتیں کرتی ہے، کہ دل بے اختیار قربان ہونے کو چاہتا ہے۔ کمپنی کے ساتھ ہندوستان کے سارے شہروں میں پھر آئی ہے، لیکن یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے شہر ایک خط مستقیم میں گویا ایک تار کے اوپر سلسلہ بسلسلہ بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگی بمبئی کے بعد کونسا شہر آتا ہے۔ اول میں نے اس سوال کو سمجھا نہیں، لیکن اس نے خود ہی، ایک کے بعد ایک دیا سلائی رکھ کے مجھے سمجھانا اور گننا شروع کیا: بمبئی کے بعد دلی، دلی سے لکھنو، پھر بنارس پھر امرتسر پھر لاہور، پھر حیدرآباد، پھر کلکتہ آتا ہے؛ اور اس بات سے جھٹکے کہ میں اتنی دیر میں سمجھتا ہوں، مجھی سے پوچھنے لگی: ایک

اس وقت میں بھی دیا سلائیاں رکھ کے گنانے لگا: مدراس، مدراس کے بعد پشاور، پھر بنگلور، پھر رنگون، پھر اماراباد، پھر ٹمبکٹو، یہ آخری نام سنکے مارے خوشی کے اچھل پڑی، ٹمبکٹو، ٹمبکٹو خوب نام ہے۔ وہاں ناٹک بھی ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر کہیں میں کہتا کہ ہاں ہوتا ہے تو وہ شاید وہاں تک جاتی، مگر کہیں دفع بھی ہو کیونکہ میری طبیعت اس لڑکی سے بھر گئی۔

فرامرز کی طبیعت ہر کسی سے بھر جاتی تھی۔ یہ لڑکی بمبئی سے چلی گئی، شاید ٹمبکٹو کا ناٹک دیکھنے گئی ہوگی، کہ میں نے سنا کہ فرامرز نے کیا لا بل میں اک جرمن گورنس سے راہ و رسم پیدا کی ہے۔ اس زمانہ میں مجھسے اک دفعہ ملتے ہی اس گورنس کے متعلق اپنی رائے بیان کرنے لگا: "اس قدر کھاتی ہے، اس قدر کھاتی ہے کہ نفرت ہو گئی، اگر تم کہیں اسے اپنے ہونٹوں اور دانتوں سے ادھ کچے بیف سٹیک کا خون پونچھتے دیکھو تو . . . اف"، حضرت کا عشق بہت سے بہت اک مہینہ رہتا تھا۔ اس ایک مہینہ میں نہایت بے پروا اور خوش خوش نظر آتا کہ یکایک پھر اس پر تھکن اور غمگینی چھا جاتی، مگر ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک خیال، جو اس کے دل میں ایسا بیٹھ گیا ہے کہ ہٹائے نہیں ہٹتا، اسی کا تعاقب کرتا پھرتا ہے۔ مگر وہ ہاتھ نہیں لگتا۔

اس کے ان تمام کھیل تماشوں، ان تمام دل لگیوں، اور پھر ان تمام کسالتوں میں یہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس پہلے اس سچے عشق کی جرأت کے لیے ایک غیر قابل حصول دوا تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ہر نئی دلبستگی ختم ہونے کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اس پہلے عشق کی بحث چھیڑ دیتا۔

اک دن اتوار کا دن تھا، وہ گاڑی پر میرے ہاں آیا، اور باہر سے یہ کہلا کے بھیجا کہ جلد کپڑے پہن کے آیئے، میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں مجھے چوپاٹی پر لیجانا چاہتا تھا، یہ بھی اک وہ دن تھا جب کہ اس کے نت نئے تعلقوں میں سے ایک تعلق ختم ہوا تھا، آجکل وہ تھیٹر کی مخلوق اور وہیں کی سڑکوں میں چکر لگایا کرتا تھا۔ گرانٹ روڈ چھوڑ کے چوپاٹی پر جانے کے ارادے پر میں نے تھوڑا سا مسرت آمیز تعجب ظاہر کیا۔ وہ کہنے لگا: "ہاں میں وہاں کی تمام ناپاکوں اور ناپاکیوں سے بیزار ہوگیا۔ اب میں ایک ایسی صورت دیکھنے کے لئے محتاج ہوں کہ کچھ تب مجھے پاک کرے، ایک ایسی صورت جو مجسم آسمانی شعر ہو"

آج ایک پارسی تہوار تھا، سمندر کے کنارے شام کے قریب، پارسیوں کا نظر فریب مجمع تھا، انکی رنگا رنگ کی ساڑھیاں، جنہیں بنگالنیں، مرہٹنیں سب ہی پہنتی ہیں مگر جنہیں حسن طبیعت کے ساتھ پہننا صرف یہ ہی جانتی ہیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ لڑکیاں، بال کھولے۔ باندھے طرح طرح کی پھولدار ٹوپیاں پہنے سمندر کے کنارے گھونگے اور سیپیاں جمع کرتی تھیں۔ آسمان پر قوس قزح نکلی ہوئی تھی جس کے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی اقلیم میں، قوس قزح کی پریاں پھر رہی ہیں، اور قوس قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہو وہ یہاں نہ آئے۔ مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں۔ وہ پھولوں کے درمیان سمندر کے کنارے آبشاروں کے قریب، سبزے کے اوپر، موسیقی سے بھری فضا میں کب ہوتی ہیں؟

ہم دونوں نے تھوڑی دیر خاموش دو ایک چکر لگائے، وہ کبھی گہری نظریں ڈالتا، کبھی ایک طرف کو سر جھکاتا، گویا کسی خیال میں غرق تھا، یکایک کہنے لگا: ہاں یہ چہرہ بیشک ایک نا موزوں شعر ہے، بشرطیکہ اس چہرے کا بھولا پن، فرشتہ پن قایم رہے اور اس دوسری میں دیکھو پلکیں کس بلا کی ہیں۔ تم نے کبھی خیال کیا ہے بعض اوقات ایک مبہم سما نظر آتا ہے اور اک دم نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا چہرہ نظر پڑتا ہے۔ اس کے نقش جم رہے ہوتے ہیں، اس کی تصویر لوحِ دل پہ کھنچی ہوتی ہو کہ یکایک ایک خیال موہوم کی طرح وہ بھی نظر سے دور ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ یہ چہرے جو پورے نہیں دیکھے جاتے۔ پورے نہیں دیکھے جاتے سے میرا مطلب دل بھر کے نہیں دیکھے جاتے، ان باصرہ فریب مناظر میں دماغ کے اندر ایک خواب کی سی کیفیت لا کر گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہانتک کہ یہ چہرے مل ملا کے ایک کا تبسم، دوسری کی نظر، تیسری کی ادا، چوتھی کے بال ایک پُر لطف مجموعہ دماغ میں پیدا کر دیتے ہیں، پھر اس طرح سے بنا ہوا مجموعہ... یہانتک کہہ کے یکایک ٹھٹکا، اور ٹھٹک کے ایک سامنے سے گذرنے والی فتن پر نظر ڈالی۔ ہاں بیچارہ تمام اس طرح سے بنے ہوئے مجموعوں کے ذریعے سے ہی، اس پہلے عشق کی ہی جستجو کرتا تھا۔ جانے میرا دل میں یہ خیال کیسے آیا شاید اس امید پر کہ اس بیماری کی جسے اس ملاقات میں اس نے بصراحت ظاہر کیا تھا، یہ دوا ہو گی میں نے کہا: "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اس نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی گویا اس سے کوئی بڑی حیرت انگیز بات کہی گئی پھر ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا: "دیکھو یہ فکر فوراً قابل عمل فکر تو نہیں" میں نے اس ہنسی کے جواب کا کچھ جواب نہیں دیا تھا، وہ تھوڑی دیر چپ رہا اور سامنے

سے گذرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا، پھر یکایک میری طرف سر پھیر کے کہنے لگا " لیکن بھائی جان، میں کس کے ساتھ شادی کروں؟"

میں اس عرصہ میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا، نہ معلوم دفعتاً اُس کا خیال اس بات کی طرف کس طرح گیا، میں فوراً جواب نہ دے سکا لیکن اُسنے جواب کی حاجت ہی نہ چھوڑی کہنے لگا " اور کس لئے شادی کروں بیاہ شادی سے انسان ایک نہایت اچھی عورت اور شاید نہایت خوبصورت بچے حاصل کرسکتا ہے۔ مگر اس کے سوا؟"

" اس کے سوا اور کیا چاہتے ہو اسمیں بھی ایک شعریت ہے، بلکہ اصلی شعر حیات اسی میں ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنے کے لیے، اس کا لطف اُٹھانے کے لئے قلب کو بہت سی چیزوں سے خالی کرنا ضروری ہوگا "

وہ رُکا، پھر اُس نے جواب میں کہا: " میں اپنے دل کو خالی کرنا نہیں بلکہ مختلف چیزوں اسی قدر بھرنا ٹھونسنا چاہتا ہوں کہ آخر تاب نہ لاکر پھٹ جائے " پھر رکا، تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، اور پھر گذرنے والی گاڑیوں پر نظر ڈالتا رہا؛ اس کے بعد ایک شدید حرکت کے ساتھ میری طرف مڑ کے، اُس نے اول دفعہ مجھسے اعتراف کیا " کبھی یہ خیال کرتا ہوں کہ اس وقت میں نے بڑی غلطی کی: شاید اگر اُس کے ساتھ شادی کرلیتا، تو ممکن ہے کہ اس اضطراب دل کو سکون ملتا۔ آہ تم کیا جانو کہ مجھے کبھی کبھی کیسا سخت اضطراب ہوتا ہے "

آخر اس بدبخت شخص نے، جس کے منہ سے یہ اظہار حقیقت نکل آیا تھا، پہلے آہستہ سے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ کو لے لیا۔ اور پھر گویا اپنے اضطراب کے درجۂ شدت کو جتانے کے لئے اپنی پوری قوت سے میرے ہاتھ کو دبا ڈالا۔ اُس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا

کہ کیوں ازدواج کا ذکر اُس سے کیا کیونکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس ذکر سے میں نے اُس کے کیسے حساس نقطۂ قلب کو ٹھیس لگائی گویا میں نے اپنی انگلی تلاش کر کے اُس کے زخم پر رکھدی اور ایسی ٹھیس لگائی جس سے اُس کو جتنی تکلیف پہنچ سکتی تھی پہنچ گئی۔

غالباً یہ سیر آخری سیر تھی، اس کے بعد میں بمبئی سے چلا آیا کہ قسمت نے اس مرتبہ پھر اس نوجوان کو، میری راہ میں، وکٹوریا ٹرمی نس پر، مگر بقدر تبدیل شدہ حالت میں لا ڈالا۔

آخر جب اُس نے سگرٹ کی راکھ گرا کے سر اُٹھایا تو میں نے آپ کو علٰحدہ رکھ کے پوچھا، اُس واقعہ کے بعد بمبئی آنے کا ذکر تم نے کیا تھا، وہ کونسا واقعہ تھا؟"

اُس نے اس دفعہ گویا گہرائیوں میں سے، عالم اسرار کے اعماق میں سے نکلنے والی نظر سے مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ اس نظر میں ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی کہ اس نوجوان سے جسے میں برسوں سے جانتا اور جس سے محبت کرتا تھا، میرے دل میں ایک لرزہ بار دپیدا ہوگیا۔ اس سیکنڈ میں اس شخص کے اور میرے درمیان۔ اس کا سبب، میں نہیں جانتا۔ ایک ہوائے بارد منجمد مجھے آنے لگی، اور مجھے ٹھٹھرانے لگی۔ وہ اپنی عجب نظر سے ٹکٹکی باندھے رہا اور میرے سوال کا جواب تو نہ دیا، بلکہ خود مجھ سے پوچھنے لگا:

"آج شام کو کہیں تمہیں کچھ کام تو نہیں کسی سے وعدہ تو نہیں؟"

میرے جواب نفی پر اُس نے تھوڑا سا تردد کیا، آخر کہنے لگا:۔

"تو آج شام میں تمہیں نہیں چھوڑنے کا۔ آج رات کھانا میرے ہی ساتھ کھانا"، اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ مجھے جواب موافق دے دینے میں تھوڑا سا

تردد ہے، تو نہایت درجہ صمیمیت اور عاجزی کی آواز سے کہنے لگا: میں التجا کرتا ہوں"

آج کی شام جو وقت نزامرز کے ہاں گذرا وہ میری زندگی کے مستثنا گھنٹوں میں سے ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بند درہ لے گیا، اور شام تک دو ختوں میں چپ چاپ کبھی کسی منظر کی طرف اشارہ کر کے کبھی کسی معمولی سے مضمون کے متعلق ایک آدھ بے ربط لفظ کہہ کے، مجھے ادھر ادھر ٹہلاتا رہا۔ میں بھی حقیقت یہ ہے کہ اس سکوت سے خوش تھا۔

آخر گھر لوٹ کے کہنے لگا: "بہت بھوک لگی ہے، کھانا کھانا چاہیے" میں اک غیر معلوم سبب سے گھبرایا ہوا تھا۔ ہمنے کھانا کھایا جیسے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اپنے خاص کمرے میں لے گیا اور کہنے لگا: "یہ میرا کمرہ ہے"

یہاں تاریکی تھی۔ داخل ہوتے وقت، کثیف تاریکی کی وجہ سے مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اسوقت ۔ شاید اس تاریکی کے سبب سے مجھے اک ڈر طاری تھا کہ اسپر میں غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر مجھے دیاسلائی کی رگڑ کی آواز آئی۔ اس روشنی میں جو یکایک میری آنکھوں میں آئی میں نے دیکھا کہ اس کی لرزہ دار شکل مبہم، ہاتھ بڑھا کے دیاسلائی سے موم بتی جلا رہی ہے۔ بتی سے اک سرخ غبار روشنی نکلنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بتی اس کمرے کے کثیف ظلمت کو زائل کرنے کے لئے اپنے میں کافی قوت نہیں پاتی، مگر اپنی کوشش کے پورے حملے کر رہی تھی اور اس وقت کچھ تاریک کچھ روشن حالت میں میں نے دنیا کا سب سے عجیب اک کمرہ دیکھا۔ ساری دیواروں پر سرخ کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ اور اک غیر منتظر ہوس کے ساتھ، دیواروں پر طرح طرح کے چوکھٹوں میں طرح طرح کی تصویریں

چینی کی رکابیاں جڑی ہوئی تھیں، بریکٹوں پر کہیں تاج محل کی سنگ مرمر سے
بنائی ہوئی نقل، کہیں سنگ مرمر کے یا پیتل کے بت، کہیں پنکھے، غرضیکہ
سیکڑوں طرح کی، اور سیکڑوں رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہوئی
تھیں. مثلاً ایک چینی کی رکابی تھی جس پر ایک تصویر منقش تھی: ایک گھنے
درختوں کا جنگل ہے، اس میں ایک بارہ سنگھا ہے جس کے سینگ ایک
درخت کی شاخ میں الجھ گئے ہیں اور وہ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے
اس رکابی کے پاس ہی اک بریکٹ پر ایک مکڑی کے بنے ہوئے جھولے
سے منڈھی ہوئی (جس کے اوپر سیپیاں چپکی ہوئی تھیں) وشنو مہاراج کا ڈراونا
بت رکھا ہوا تھا. ایک اور تصویر تھی جس میں اک وحشی صورت لڑکی بیٹھی
تھی جس کا آدھا دھڑ سیاہ زمین میں غائب تھا اور بالوں سے خون
کے قطرے ٹپک رہے تھے. تصویر کے نیچے دو جاپانی پنکھوں کو کھول
کے اور دیوار میں گاڑ کے ایک عظیم تتری کی شکل بنائی گئی تھی. غرضیکہ
ان دیواروں میں کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا کہ اس میں فرامرز کے فکر
عجیب نے ایک ہوس مجنونانہ کے ساتھ اپنا آشیانہ نہ بنایا ہو. ان سب
کے بعد ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کی میز، اس کے پاس اک چھوٹی سی
گول میز، اور ایک گھومنے والی کتابوں کی الماری. ان کے اوپر مختلف
گلاس، کاسے، البم، کاغذ، کتابیں تھیں. زمین پر قالین کے اوپر بھی چھوٹی
بڑی کتابیں کھلی اور بند پڑی ہوئی تھیں. پاس ہی اک چیتے کی کھال بچھی
ہوئی تھی. اور ایسی مختلف چیزیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں مگر
ہر ایک گلدان میں ایک عجیب سوکھا پودا لگا ہوا تھا جس کے پتے تیتریوں
کی طرح معلوم ہوتے تھے. اس تمام گڑبڑ پر اگر سو دفعہ نظر ڈالی جائے تو

ہر دفعہ اک نئی چیز نظر آئے، چھوٹی چھوٹی لاتعداد چیزیں تھیں جنکے وہاں ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تھا، اور پھر ان سب عجیب چیزوں کو ایک لرزش حیات دینے والی موم بتی تھی، جنہیں سے مختصر سی سرخی مائل روشنی نکل رہی تھی۔

میں ایک آرام کرسی میں بیٹھ گیا، وہ میرے مقابل مگر کچھ فاصلہ پر، کھڑکی کے پاس ایک چوکی پر بیٹھا، اور بلا کسی تمہید کے یکایک، چار گھنٹے اول کی گفتگو پر پلیٹ کے خشک آواز سے کہنے لگا: "اس واقعہ کی تمہیں خبر نہیں؟ تو میں تمہیں بتاتا ہوں، میرے ساتھ اس نے بیوفائی کی"

میری زبان سے بے اختیار "کسنے" نکلا۔

فرامرز نے فوراً جواب دیا: "اس نے"

اس وقت میں اسے دور سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ، کھڑکی سے داخل ہوکر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہوگئی تھی، ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔

اس وقت میں اسے دور سے، اس مختصر روشنی میں جس کے ساتھ، کھڑکی سے داخل ہوکر اب چاند کی روشنی بھی شامل ہوگئی تھی، ایک خیال، ایک شکل مبہم کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں وہ زیادہ ضعیف، زیادہ زرد نظر آتا تھا۔ اور اس کی اسرار انگیز آنکھوں میں، جو مجھپر گویا برف باری کر رہی تھیں اور زیادہ وحشت معلوم ہوتی تھی مجھپر اپنی باتوں کا اثر معلوم کرنے کے لئے نظر ڈال رہا تھا۔ یکایک اپنی جگہ سے اٹھا، اور میرے سامنے آیا میں پہلے ہی ہمدردی کے ساتھ سن رہا تھا، کہ اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا:-

میں سچ کہتا ہوں، میں بس اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ اس شام کو جب کہ آخری دفعہ ہم تم دونوں جو بالٹی پر تھے، وہ بھی وہاں تھی اور تیج کا موسم میں آتے ہی دیکھنے وہاں گیا تھا کہ ایک دن خواہ مخواہ میرے دل میں اک شبہ پیدا ہو گیا تھا: اگر کہیں بیوفائی کرتی ہو تو؟ میں نے ہر چیز کا شک کیا تھا، لیکن یہ خیال کہ وہ اس پاکیزہ عشق کی یاد میں صادق نہیں ہے اور میرے علاوہ کسی اور کو دل میں رکھتی ہے، مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اسنے پیار کیا، یہ اس کا حق تھا ہے نا؟ مگر اس عشق کی یاد سے بیوفائی کرنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ اس دن میں نے اسے ہنستے دیکھا، ایک نوجوان کے ساتھ ہنس رہی تھی، یعنی کہ میرے ساتھ بیوفائی کر رہی تھی، اور مجھے یقین ہے کہ صرف مجھے مار ڈالنے کے لئے ایسا کر رہی تھی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اسدن میں نے کیسی طاقت فرسا کوشش سے اپنی طبیعت کو روکا کہ دوڑ کے اس کی گاڑی پر چڑھ کے اس کا منہہ نہ نوچ لوں"

یہ کہتے وقت کانپ رہا ہے، گویا اس بیوفائی کے وہم خیال سے دست و گریبان ہونا چاہتا ہے۔

میں نے کہا، "لیکن صرف اُسے ہنستا دیکھنا کافی سند نہیں، خاصکر جبکہ تمہارا اور اُس کا بات چیت کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔ علاوہ ازیں تم کو ..... اُسنے میری بات پوری نہ ہونے دی، میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور نرم آواز سے گویا مجھے اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہے کہنے لگا: "نہیں نہیں وہ میرے ساتھ بیوفائی کرتی ہے، یہ محقق ہے، تم بھی اُسے یقین کرتے ہو، تم بھی اُس کی دہشت تاثیر، مجھے مار ڈالنے والی قوت سے واقف ہو،،

واقف ہی سمجھنا چاہیے تھا۔ کیا بحث کرتا۔ لازم یہی تھا کہ اعتراض

نہ کروں۔

کہنے لگا: "ابھی تم میری ہنسی اُڑانا چاہتے تھے، یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے بھی تو اس کے ساتھ بیوفائی کی؟ ہے نا؟ مگر یقین مانو کہ وہ تمام عورتیں جن سے میں ملتا تھا، وہ دل بہلاوے تھے، وہ اُس عذاب اور اضطراب کے گھٹانے کے لیئے کھلونے تھے جو اُسے نہ بھولنے کی وجہ سے میرے دل کو پریشان کیئے ہوئے تھا۔ میری زندگی میں اگر کوئی چیز تھی، تو صرف وہ تھی۔ میں اُسے ہمیشہ صاف و پاک، ہمیشہ پُر شعر و خیال دیکھنا، اور ایک پاکیزہ افق سے اُٹھے ہوئے سحابپارہ میں دُکھنا چاہتا تھا۔"

پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگا: "آہ یہ عورتیں! مجھے انکا کیسا تلخ تجربہ ہوا ہے جانتے ہو یہ کیا ہیں؟ یہ پھول ہیں جنکی دور ہی سے سیر کرنی چاہیئے! کیونکہ جو چیزیں انمیں ڈھونڈی جاتی ہیں، وہ ان میں نہیں ہوتیں۔ عورت، ایک رنگ ہے کہ اُسے دیکھنے ہو تو تمہیں مست و مدہوش کرتا ہے۔ مگر یہ رنگ اس لیئے بنا ہے کہ صرف دور سے دیکھا جاسے۔ اسے چھونا مت، کیونکہ چھوتے ہی اُڑ جائیگا، اور ایک پژمردہ داغ کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا۔ یا عورت، ایک روشنی ہے نظر فریب و دلبار، ایک خندۂ ضیا ہے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا، کیونکہ روشنی غائب ہو جائیگی، اور خندۂ ضیا کے بدلے، تاریکی رہجائیگی۔ اُف! عورت سے توقع ہوتی ہے قصیدہ کی، ملتا ہے مرثیہ، امید ہوتی ہے ان ہاتھوں سے تھپک کی، دیتے ہیں زخم۔ غضب یہ کہ یہ زخم بالکل باریک خط سے ہوتے ہیں، فوراً بھر جاتے معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ

ناخنوں سے یہ زخم بنتے ہیں، اس میں ایک قطرہ زہر ہوتا ہے، وہ اُس زخم میں نفوذ کر جاتا ہے، اور آہستہ آہستہ، اُس آگ کی طرح جو کرۂ زمین کے پیٹ میں ہو، وہ وہاں دھاتوں کو پگھلا رہی ہے یہ بھی تہ بہ تہ خون میں گھس جاتا ہے، اور جہاں گھستا ہے، اسے مسموم کرتا ہی ہے، ہر قطرہ خون میں ایک قطرہ مہلک اور بڑھاتا ہے، یہانتک کہ تمہاری زندگی زہریلی ہوجاتی ہے۔ تم ہنستے ہوتے ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہوتی، وہ اپنے فرض تخریبیہ کو پورا کرتا ہوتا ہے۔ تم اس وہم میں ہو کہ تم زندگی بسر کررہے ہو، وہ تمہیں مار رہا ہوتا ہے۔ ثانیہ ثانیہ تمہاری زندگی میں سے ایک ایک ذرہ لیکر تمہیں برباد کرتا ہے، اکھاڑتا ہے، جلاتا ہے۔۔

اب اُس کی آنکھوں کی ایک کیفیت۔کس لفظ سے تعبیر دوں؟ ایک جانکنی کی سی کیفیت پیدا ہورہی تھی، اور گویا اُس سے ایک بحر حزیں کی سیاہ موجیں جوش مار رہی تھیں میں اس کی باتوں میں ذرا سا ہرج نہ کرنا چاہتا تھا، صاف تو یوں ہے کہ اس غیر معمولی زمین میں اس غیر معمولی آدمی کے ساتھ بحث کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا، اور ان آنکھوں کے مقابلہ میں میرے دل میں کبھی ڈر کبھی رحم پیدا ہوتا تھا، اور میں اپنے سگرٹ کے دھوئیں کی آڑ میں اُن آنکھوں سے چھپنے کی کوشش کررہا تھا۔ صرف اس کی باتیں سننا چاہتا تھا، وہ یکایک کھڑا ہوگیا۔ اب اُس کی طبیعت میں ایک ہیجان تھا، کہنے لگا:

تمسے ایک بات کہوں؟ صرف تمسے کہونگا، کیونکہ تم سے کسی قسم کا اندیشہ یا خوف نہیں ہے۔ اس وقت تک میرے نزدیک۔۔۔ نیا میں اگر

[illegible]

نزدیک بالکل مرگئی [illegible] دیکھو میں تمہیں بتلاؤں، یہ کہکے اس نے
میرا بازو پکڑ لیا۔ پھر دالان کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کے آسمان کے ایک کونے
کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہنے لگا دیکھتے ہو؟"

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس چیز کو دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا؟"

وہ خاموش ہو رہا۔ پھر سے اشارہ کر [illegible] اور اس چیز کا نام لئے بغیر کہتا رہا:
[illegible] مجھے [illegible] ہوئی تھی [illegible] رنگ مرمر
کا ایک بت تھا۔ [illegible]
ایک پاؤں سے کھڑی تھی [illegible] لینے کے لئے اپنے
دونوں ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے تھی۔ [illegible] کا ایک لطیف نمونہ

ذرا مرزا میرا شانہ پکڑے رہا۔ گویا اس سے لڑ کر کوئی [illegible] لے
آہستہ آہستہ کہنے لگا [illegible] مجھے [illegible] کندھا پکڑے
[illegible] میرے منہ پر اس کے سانس کا لگنا مجھے گھبرا رہا تھا
وہ کہہ رہا تھا:

"ایک رات تھی آج کی سی اجالی رات نہیں۔ برسات کی گھپ اندھیری
رات تھی۔ کتنا زمانہ ہوا مجھے یاد نہیں۔ اندھیری رات تھی۔ میں اسی کمرے
میں تھا اور بتی نہیں جل رہی تھی۔ میں اس اندھیری رات میں بجلی کی سیر کر رہا
تھا۔ مگر اس کا خیال کر کے تم نے تاروں پر بھی بجلی کو کبھی کوندتے دیکھا
ہے۔ دیکھو اس کھڑکی سے وہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس رات یہ تارے اور سیاہ
معلوم ہوتے تھے۔ ایک سیاہی طاری تھی کہ بجلی اس سے جنگ کر رہی تھی،
اور غائب ہو ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں
کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا کے، گاڑ گاڑ کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا ہے

ورائس سے ایک لمحہ کے لئے ایک فلانہ خون نکلتا ہے اور پھر سیاہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ میں اُس کی سیر کر رہا تھا۔ مگر خیال میں وہی تھی۔ یکایک مجھے کمرے میں ایک حرکت سنائی دی، اور کوئی سانس لیتا ہوا معلوم ہوا۔ میں مارے ڈر کے کانپا اور کچھ جم کے رہ گیا۔"

اب میرے کندھوں کو اور دبا رہا ہے اور گویا کہیں وہ نہ سن لے، مجھ سے اور مِلا، اور ہاتھ سے آسمان دکھا کے اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"یہ تھی، ہاں یہی۔ اس کرہ کو اپنے پاؤں تلے لڑھکاتی میرے پاس آئی۔ اور آتے وقت اُس تاریکی میں لرزتی اور قدمیں بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے بعد بجلی چمکی تو میں نے اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا، میرے پاس آئی تھی۔ میرے کندھوں کو اور دبا رہا تھا، مجھ سے اور ملتا جاتا تھا۔ میرے پاس آئی اور اپنے عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ تاروں کی تاریکی پر اہرمن اپنے چمکدار جنگلوں سے خواں گزار رہا تھا، کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسہ محبت کے ساتھ ایک عمر بسر کر گئے۔ اب اُس رات کے بعد، ہر رات تاریکی میں، لرزتی لرزتی اپنے کرہ کو لڑھکاتی لڑھکاتی اور آگے آتے وقت قدمیں بڑھتی بڑھتی آتی ہے اور اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے اور ایک لمحہ میں، اُس لمحہ میں جو ایک عمر کے طول کی برابر ہوتا ہے۔ مجھے وہ لطف زندگی دیتی ہے، جو کسی عورت میں نہیں، نہ اُس میں نہیں جس نے میرے ساتھ بیوفائی کی۔ اور یہ میرے ساتھ بیوفائی نہیں کرنے کی"

اس تقریر کو ختم کرکے، فرامرز نے میرے کندھے چھوڑ دیے۔

دو تین قدم پیچھے ہٹ کے کرسی پر بیٹھ گیا، کہنی گھٹنوں پر رکھ کے سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں مجھے ایسا نظر آیا کہ رو رہا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا، ہائے بیچارے سینہ کا داغ!

میں بمبئی سے چلا آیا، مگر فرامرز سے پھر ملنے کو دل چاہتا ہے۔ خبر نہیں اُس نے اپنے اس پرستیدہ سنگیں سے بھی کہیں بیوفائی تو نہ دیکھی +

سجاد حیدر

غزل

شوخی نہیں دیکھی کہ شرارت نہیں دیکھی
ہاں آپکی آنکھوں میں مروت نہیں دیکھی

اظہار محبت پہ ہنسی آتی ہے ہنس لو
تم نے ابھی تاثیر محبت نہیں دیکھی

جاتے ہوئے دیکھا نہیں کیا تجکو وہ غیر
آتی ہوئی کس روز قیامت نہیں دیکھی

مانا نہیں اس لئے کہ عاشق ہے یہ میرا
جب تک کسی ناشاد کی تربت نہیں دیکھی

وہ رنگ وہ روپ انکے کہاں صبح شب گل
اسطرح کبھی لٹتی کوئی دولت نہیں دیکھی

کیا آئے نظر میں کسی بیکس کی مصیبت
ظالم کبھی تو نے شب فرقت نہیں دیکھی

بلبل سے ہے بہتر انکی تو پھولوں میں ہنسی ہے
اس رنگ کی واللہ طبیعت نہیں دیکھی

یہ کیا کہ دبے جاتے ہو تم بار نظر سے
ایسی بھی کہیں ہم نے نزاکت نہیں دیکھی

خون دل بلبل نے عجب کام کیا ہے
پھولوں میں کبھی ہم نے یہ رنگت نہیں دیکھی

دیکھا ہے کہ آئی ہوئی ٹل جاتی ہے لیکن
ٹلتی ہوئی سر سے شب فرقت نہیں دیکھی

اتنا بھی نہ چاہو کسی مہ پارہ کو اختر
تم نے کبھی آئینے میں صورت نہیں دیکھی

مالوہ کی سیر

قلعہ دولت آباد

دکن میں سب سے قدیم مضبوط اور عالیشان دولت آباد کا قلعہ سمجھا جاتا ہے جس پر چھ سو برس سے اسلامی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو میں نے اس مشہور قلعہ کی سیر کی قبل اس کے کہ اس کی موجودہ حالت بیان کروں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی مختصر تاریخ بھی سنا دوں ہندوؤں کے زمانہ میں قلعہ کا نام دیوگری اور آبادی یعنی شہر کا نام دیوگڑھ تھا جس کو غلطی سے اکثر مسلمان مورخین نے دیوگیر لکھا ہے چنانچہ بدر چاچ - محمد شاہ تغلق کے دربار کا مشہور شاعر اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

کہ دیوگیر مخوانش کہ دولت آباد ست

کہ چار طاق در او ہست ہشت باب جہاں

سب سے پہلے ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء میں جلال الدین خلجی کے عہد سلطنت میں اس کے بھتیجے اور داماد علاؤ الدین خلجی نے سات آٹھ ہزار سوار سے اس شہر پر حملہ کیا اس وقت یہاں کا راجہ خاندان یدو سے رام دیو تھا وہ مقابلہ کی تاب نہ لایا اول قلعبند ہو گیا پھر ایک ہزار من سونا سات من مروارید دو من جواہرات - ایک ہزار من نقرہ - چار ہزار چادر ابریشم اور دیگر بیش قیمت اشیا نذرانہ دیکر صلح کر لی اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔ مگر تھوڑی مدت بعد پھر بغاوت کی اور خراج بھیجنا بند کر دیا ۷۰۶ھ / ۱۳۰۶ء میں علاؤ الدین خلجی نے اپنے منظور نظر غلام ملک کافور کو ایک لاکھ سوار

کے ساتھ دکن کی تسخیر کے واسطے روانہ کیا۔ راجہ نے مقابلہ کی طاقت
نہ دیکھی اپنے چھوٹے بیٹے کو قلعہ میں چھوڑ کر خود معہ تمام بال بچوں اور
ساز و سامان کے ملک کافور کے پاس حاضر ہو گیا۔ ملک کافور سنہ ۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء
میں اُسے ساتھ لیکر بادشاہ کے پاس آیا۔ علاؤ الدین کو راجہ کا یہ طرز
عمل بہت پسند آیا خطاب رائے رایاں چتر سفید ایک لاکھ تنکہ نقد
کے علاوہ قصبہ نوساری (گجرات) بھی مرحمت کر کے اسے واپس بھیج دیا
یہ راجہ جب تک زندہ رہا شاہی اطاعت میں رہا اور ملک کافور کو مہم
ورنگل وغیرہ میں قابل قدر امداد دی۔ سنہ ۷۱۲ھ ۱۳۱۲ء میں رام دیو کے مرنے
کے بعد اس کے بیٹے شنکر نے بغاوت کی ملک کافور نے دوبارہ وہاں
پہنچ کر قلعہ کو فتح کیا اور شنکر مارا گیا۔ اس کے بعد ملک کافور شاہی
لشکر قلعہ میں چھوڑ کر واپس ہوا۔ مبارک شاہ خلجی کے عہد میں ہرپال
نے جو راجہ کا داماد تھا قرب و جوار کے راجاؤں کو متفق کر کے بغاوت
کی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء میں مبارک شاہ نے اس کو شکست
دے کر قید کیا اور کھال کھچوا کر اس کا سر قلعہ کے دروازہ پر لٹکوا دیا اور ایک
عالیشان مسجد تعمیر کرائی جو اب تک قلعہ کے اندر موجود ہے۔ سنہ ۷۲۹ھ ۱۳۲۸ء
میں سلطان محمد شاہ تغلق نے دہلی کو ویران کر کے اس شہر کو آباد کیا
اور دارالسلطنت بنانا چاہا اور دہلی سے دولت آباد تک کہ آٹھ سو
میل کا فاصلہ ہے منزل بمنزل پر سرائے بنوائی اور سڑک پر دو رویہ
درخت لگوائے قلعہ کے گرد عمیق خندق اور متعدد حصار اور قرب و جوار
میں سنگین تالاب و عالیشان عمارتیں۔ باغات تعمیر کرا کر شہر کا نام دولت آباد
رکھا۔ چنانچہ قلعہ سے ایلورہ تک ۶-۷ میل کا فاصلہ ہے برابر اس عہد

آبادی کے نشانات پائے جاتے ہیں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اسے آبادی کی حالت میں دیکھا تھا وہ لکھتا ہے کہ یہ بہت بڑا شہر ہے دہلی کا مقابلہ کرتا ہے اس کے تین حصہ ہیں ایک کو دولت آباد کہتے ہیں اس میں بادشاہ اور اس کا لشکر رہتا ہے دوسرے حصہ کو کٹکہ کہتے ہیں تیسرے حصہ کو جو قلعہ ہے دیوگیر کہتے ہیں یہ قلعہ مضبوطی میں بےنظیر ہے اعظم قتلو خاں بادشاہ کا استاد اس قلعہ میں رہتا ہے ساگر اور تلنگانہ بھی اسی کے ماتحت ہے اس کا علاقہ تین مہینہ کی مسافت میں پھیلا ہوا ہے۔ قلعہ سطح زمین میں ایک چٹان پر واقع ہے اس چٹان کو کھود کر چوٹی پر قلعہ بنایا ہے۔ قلعہ کے اوپر چمڑے کے بنے ہوئے زینے سے چڑھتے ہیں۔ رات کے وقت اس زینہ کو اوپر اٹھا لیتے ہیں اس میں بڑے بڑے غار ہیں جس میں مجرم قید رکھے جاتے ہیں۔ ان غاروں میں ایسے بڑے بڑے چوہے ہیں جن سے بلی بھی ڈرتی ہے۔ دولت آباد کے باشندے مرہٹہ ہیں ان کی عورتیں نہایت خوبصورت ہیں شہر کے ہندو جن کو ساہ کہتے ہیں جواہرات وغیرہ کی سوداگری کرتے ہیں۔ یہاں آم اور انار بہت ہوتے ہیں اور سال میں دو دفعہ پھلتے ہیں۔ یہاں اہل طرب کا ایک بازار ہے جس کو طرب آباد کہتے ہیں یہ بازار بہت خوبصورت وسیع ہے دوکانات بھی بہت ہیں الخ۔"

محمد شاہ تغلق ہی کی زندگی ہی میں ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء میں یہ قلعہ باغیوں نے چھین لیا اور دکن میں ایک جدید سلطنت بہمنیہ قائم ہوئی ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء تک سلاطین بہمنیہ کا قبضہ رہا ان کے بعد احمد نگر کے سلاطین نظام شاہی کے قبضہ میں آیا۔ ۱۹ ذالحجہ ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء کو شاہجہان کے زمانہ میں مہابت خان

نی امیر نے ان سے تعیین کر خاندان مغلیہ کی سلطنت میں شامل کیا وشعبان ۱۱۹۵ھ کو سید محمد خان امیر الممالک خلف سوم نواب آصف جاہ کے زمانہ میں صلحنامہ کی رو سے مرہٹوں کے قبضہ میں گیا جس کی تاریخ کسی نے کہی ہے ؎

گرفتند کفار احمد نگر را | اگر دولت آباد حصن علم رفت
خرد سال تاریخ بسلخ گیتی | ہنوز زد رقم دولت آباد رفت

دو برس آٹھ مہینے اور چودہ دن بعد ۲ جمادی الاول ۱۱۹۷ھ کو نواب نظام الدولہ آصف جاہ ثانی نے پھر مرہٹوں سے فتح کر لیا جس کی امیر حیدر نے یہ تاریخ لکھی ہے ؎

نظام الدولہ آصف جاہ ثانی | بزور تیغ و بازو قلعہ بکشاد
امیر از بہر تاریخش رقم زد | نمودہ فتح حصن دولت آباد

میر ذکا نے دولت آباد رفت باز آمدہ تاریخ کہی اسوقت سے یہ ریاست نظام حیدرآباد کے قبضہ میں چلا آتا ہے اورنگ آباد سے ۱۰ میل اور بمبئی سے ۲۰۰ میل کے فاصلے پر واقع اور نظام ریلوے کا اسٹیشن ہے موجودہ آبادی صرف دو ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے جس پہاڑی پر دولت آباد کا قلعہ واقع ہے وہ زمین سے ۶۰۰ فیٹ بلند ہے۔ قلعہ کے نیچے تین فصیلیں ہیں بیرونی فصیل کا حلقہ پونے تین میل کا ہے فصیل میں ۵ دروازے اور ۵۴ کھڑکیاں بتلائی جاتی ہے اکثر دروازوں پر شیروں اور ہاتھیوں کی مورتیں بنی ہوئی ہیں فصیلوں کے اندر داخل ہو کر سب سے پہلے ایک مینار ملتا ہے جو باہر سے بھی نظر آتا ہے یہ چار منزل کا مینار ۱۰۰ فیٹ بلند ہے۔ زمین سے ۴۲ سیڑھیاں چڑھکر ایک دروازہ

جس کے پہلو میں ... بعہد سلطان علاؤالدین خلجی قلعہ ... اور ... بند ... ابن
... مینار خلجی قلعہ ... کے گنبد ہے ... دروازہ میں داخل ہو کر ایک ... ہے
کی چھوٹی سی مسجد ... ہے جس کے اندر ایک پتھر پر فارسی شعر کا کتبہ ... ہے
جس کا ... ہے کہ ... ... نے ... ایک ... پر
ذی ... آئی ... کی ... ... اس سے ... عالی ... نسیم
... کے عہد ... کے ... اس مینار کو
تعمیر کرایا تاریخ کی ... ہے ...

تاریخ مینار دولت آباد ... ۸۴۹ ... شد آباد

تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۴۲ھ میں احمد شاہ بہمنی نے ملک التجار
خلف حسن بصری کو دولت آباد ... عالم ... کیا غالباً یہ وزیر
ملک التجار کا ... نام ہوگا کیونکہ علاؤالدین ... دولت آباد اور
اطراف پر حاکم ہونے کا پتہ چلتا ہے ... مسجد کی چھت سے مینار کی سیڑھیاں
شروع ہوتی ہیں۔ مینار کے نیچے کی عمارت ... درمیان ... کا نیلا ... کا
کام ابھی کہیں کہیں باقی ہے۔ مینار ... ہے۔

مینار کے سامنے راستے کے دوسری طرف عظیم الشان مسجد ہے
اس مسجد پر کوئی کتبہ نہیں ہے لیکن طرز تعمیر سے ... جامع ... قطب الدین
جو مبارک شاہ خلجی نے تعمیر کرائی تھی ... ہے ... سوم
ہے ... درجہ کی مسجد ہے جس ... ستونوں ... درمیان ...
باقی چھت ... ستونوں کے درمیان ... پتھر ... نہایت
وسیع صحن ہے جس میں دو چبوترے ... شمال ... جنوب ... ایک
ایک چھوٹا دروازہ اور مشرق میں گنبد دار صدر دروازہ ہے ... دروازے

باہر ایک وسیع پختہ حوض مربع شکل کا ہے جس کا ہر ضلع ۱۵۰ فیٹ اور گہرائی ۱۵ فیٹ ہے۔ دولت آباد سے قریب ایک میل کے فاصلے پر دو پہاڑوں کے درمیان میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا ہے جو اب تالاب اباز درہ کے نام سے مشہور ہے اس تالاب سے قلعہ تک شاہی زمانہ کے نل لگے ہیں ان کے ذریعہ سے اس حوض میں پانی آتا ہے اب تک یہ نل درست ہیں۔ محمد تغلق کے زمانہ میں قتلغخان یا قتلو خاں نے ایک پختہ حوض تعمیر کرایا تھا جو اس زمانہ میں حوض قتلو کے نام سے مشہور تھا غالباً یہ وہی حوض ہے۔

خاص قلعہ کی چڑھائی پر نیچے سے اوپر تک تین چار دروازے ہیں۔ ایک آہنی توا رکھا ہے جو ضرورت کے وقت دروازہ پر ڈال کر اس کے اوپر آگ جلادی جاتی تھی جس وقت توا دہک جاتا تھا نیچے سے کوئی شخص اوپر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ سوا اس ایک راستہ کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ راستہ میں کئی شکستہ عمارتیں۔ پہاڑ کے نیچے کئی تالاب جو کوڑی ٹانکہ ستی ٹانکہ۔ انبوٹی ٹانکہ وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں ملتے ہیں۔ کئی تیرہ و تار غار ہیں جن میں پولٹیکل قیدی رکھے جاتے تھے۔ ایک گنبد کے نیچے کھڑکی کے اندر مزار ہے جو مینا گری سلطان کا مزار کہلاتا ہے علاوہ معمولی چڑھاؤ کے ۱۰۰ سیڑھیاں چڑھکر سب سے بلندی پر ایک مثمن کمرہ ہے جس کے ہر ضلع میں ایک ایک دروازہ اور چاروں طرف برامدہ ہے درمیان میں چبوترہ اور اردگرد دالان بنے ہیں یہی جگہ حکام کا قیام ہوتا ہے لہذا یہ عمارت اچھی حالت میں ہے اور سفیدی وغیرہ ہو رہی ہے یہاں کے دلفریب اور خوشنما منظر کا سماں

کاغذ پر کھینچنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ معمولی طور سے کوسوں کا منظر پیش نظر ہو جاتا ہے اور ہمارے پاس تو دوربین موجود تھی کوسوں تک کا سبزہ پہاڑ۔ درخت غرضکہ گلستان قدرت کا نمونہ نگاہ کے سامنے تھا۔ اس بارہ دری سے سو سوا سو سیڑھیاں اوپر چڑھکر ایک چبوترہ بنا ہے جس پر گورنمنٹ نظام کا اسلامی جھنڈا اُڑ رہا ہے۔ اور قدیم زمانہ کی سب سے بڑی توپ رکھی ہے اس کی لمبائی ۱۶ فیٹ ہے۔ الغرض قطر ۵ فیٹ ہے توپ کے اوپر ہندی میں بھی کچھ لکھا ہے اور فارسی میں "وصول دہان چورا کرہ" طول ۲۰ ہاتھ۔ عمل منگلجی ولد رگھنات گشنداس ولد لالجی ۱۸ تحریر ہے۔ چبوترہ کے نیچے کا مقام جنار دھن دیو کی بیٹھک کے نام سے موسوم ہے جس پر ہر اکادشی کو میلہ لگتا ہے۔

گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابو الحسن تاناشاہ اورنگ زیب کے عہد میں اسی قلعہ میں نظر بند تھا۔ پچاس ہزار روپیہ سالانہ اس کا وظیفہ مقرر تھا قلعہ کے کھنڈرات میں ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کے دروازہ پر نہایت نفیس خوبصورت اور باریک چینی کا کام کیا ہوا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تاناشاہ اس مکان میں قید تھا۔ انگریز اس چینی کے کام کو بہت پسند کرتے ہیں جو دیکھنے آتا ہے وہ تھوڑا بہت نمونہ ساتھ لے جاتا ہے۔ بقول شخصے شیخ کی داڑھی تبرک ہی کی نذر ہوئی۔ نیچے کا کل کام نمونہ کے نذر ہو گیا اوپر کچھ کام موجود ہے۔ قلعہ کے برجوں پر بہت سی چھوٹی بڑی قدیم زمانہ کی توپیں اب تک رکھی ہوئی ہیں جن میں سلیمانی توپ اور مینڈھا توپ بہت مشہور ہیں۔

مینڈھا توپ کے پشت کی جانب مینڈھے کی شکل اور اوپر دو چھوٹے چھوٹے شیر بنے ہیں اور نہایت نفیس جال کھنچا ہوا ہے۔ خط نستعلیق میں اوپر "ابو الظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" بیچ میں "توپ قلعہ شکن" اور نیچے "عمل محمد حسین عرب" تحریر ہے۔ اس کی لمبائی ۸ فیٹ ۱۰ انچ ہے اور بہت خوبصورت توپ ہے۔

شمالی جانب بیرونی فصیل کے باہر چھوٹی سی خوبصورت مسجد اور ایک بزرگ برہان الدین رح کی درگاہ ہے۔ اور بھی کئی حوض مسجدیں باؤلی حمام اور بہت سے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ محمد تغلق اور اس سے بھی پرانے زمانہ کی بارود۔ تمباکو اور دیگر اشیا دا ب تک کوٹھوں میں بھری ہوئی ہیں بارود وغیرہ کے کوٹھے مقفل ہیں تمباکو کی رسیاں خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ قلعہ کے باہر آبادی کے قریب ایک عظیم الشان حمام ٹوٹا پھوٹا باقی ہے جس کے درمیان میں ایک بڑا حوض ہے دروازہ پر "محب اہل بیت رسول اللہ محب خان کتبہ عبدالقادر الحسینی سنہ ۹۹۰ھ" کندہ ہے۔

قلعہ کی فصیل کے اندر سے ہوکر جو سڑک ایلورہ کو گئی ہے اس پر قلعہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک میل کے قریب چڑھائی ہے۔ اور سڑک کے دونوں طرف ایک ایک چھوٹا سا منارہ بنا ہوا ہے۔ ایک منارہ پر یہ بیت کندہ ہے ؎

از سر نو مرمت این راہ　　کرد یعقوب بندۂ درگاہ ۱۱۹۴

دوسرے پر عبارت نثر ہے جس سے واضح ہے کہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں حسب فرمان جناب نواب سالار جنگ بہادر مرمت ہوئی۔ انتہائے

بلندی کا منظر بہت خوشنما ہے نیچے دو پہاڑوں کے درمیان میں ہی آبازدرہ کا پختہ وسیع تالاب ہے جس کی ترائی کے سرسبز درخت سبزہ زار نہایت بھلا معلوم ہوتا اور فرحت بخش ہے ۔ ئی گنبد ۔ ۔ ٹوٹی ہوئی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں ۔

سعید احمدؐ مارہروی

زندگی ایک گھنٹہ ہے ! ہمارے دماغ مفقود سلسلہ گھنٹے ہیں ۔ زیست کا فرشتہ اُن کو صرف ایک بار سب کے لئے کوک دیتا ہے اور پھر اُن کا دروازہ بند کرکے کنجی اُس فرشتے کو دیدیتا ہے ۔ جو قیامت کے دن مردوں کو از سر نو زندہ کریگا خیال کے پہئے برابر ٹِک ٹِک چلے جاتے ہیں ۔ ہماری مرضی اُنہیں ٹھہرا نہیں سکتی البتہ دیوانگی اُنکی رفتار تیز کردیتی ہے صرف موت گھنٹے کا دروازہ توڑکر زندہ ہوسکتی ہے ۔ اور اُس ہمیشہ ہلنے والے لنگر کو جسے ہم دل کہتے ہیں پکڑکر توڑ پھوڑ ڈالتی ہے اور آخر اُس ہولناک کَبس کی ٹِک ٹِک جسے ہم اپنے دردآلود پیشانیوں کے پیچھے سُنتے ہیں بند کردیتی ہے ۔ ایکاش ہم صرف ذہنی اسوقت قابو پا سکیں جبکہ ہم اپنے تکئے پر سر رکھے لئے ہوتے ہیں اور خیال وتصور کی جنبش کو یکے بعد دیگرے شمار کرتے ہیں کیا کوئی ایسا ہے جو اُن پہیوں کی چال روکے ۔ انکی پیلوں کو الگ کردے اور اُس زنجیر کو کاٹ دے جو یہ وزن سنبھالے ہوئے تھے ۔ بعض اوقات ہم کسقدر خاموشی وآرام کے خواہاں ہوتے ہیں اور کسطرح تہہ دل سے چاہتے ہیں کہ یہ خوفناک مشین جو وقت کے غیر منقسم پردوں کو کھول رہی ہے اور جس پر موت وحیات کی خاص تصویریں کڑھی ہوئی ہیں ۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے ۔ (ہالمز)

کشمیری پنڈتوں کی رسم شادی

زمانہ ہر ایک پرانی رسم کو بدل رہا ہے۔ مغربی رنگ ہر ایک قدیم رسم پر چڑھتا جاتا ہے۔ زمانہ حال میں ازدواج کا وہ اثر جو خاندان کو دوسرے خاندانوں سے وابستہ کرتا تھا تنزل پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں بیویوں کو اولاد بار گراں معلوم ہونے لگی ہے۔ ہر دولہا اور دلہن کو کبوتر اور کبوتری کے مثل زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے۔ بہتر ہے کہ قدیم رسوم کا حال تاریخ میں قایم رہے اس لئے ہم ایک قدامت پسند ہندو قوم یعنے کشمیری پنڈتوں کے رسم شادی کا حال بیان کرتے ہیں

برات کے پہنچتے ہی ایک ملازم پانی کا گھڑا اسمہ عیانہ کے مکان کی دہلیز پر لئے موجود ہوتا ہے پسر والے اس میں روپیہ دو روپیہ ڈالدیتے ہیں اس کو اسچ کہتے ہیں مکان میں داخل ہونے سے قبل دروازہ مکان پر ہر دو سمدھی ایک دوسرے کے سامنے ایک جایفل اور ایک روپیہ پیش کش کرتے ہیں پسر والا روپیہ اور جایفل قبول کرتا ہے دختر والا صرف جایفل لے لیتا ہے ہر دو بغلگیر ہوتے ہیں اور برات داخل ہوتی ہے ہم کو بہت دریافت کے بعد بھی یہ ٹھیک معلوم نہ ہو سکا کہ دیوگن کے موقعہ پر اور اس موقعہ پر جایفل کے تبادلہ سے کیا مراد لی گئی ہے۔

ہم قیاس سے یہ کہتے ہیں کہ کشمیر جیسے ایک برفستانی ملک میں ایک حارۃ تاثیر کا پھل خوش آیند ہونا چاہیے اس لئے جایفل کو غالباً نمونہ

گرمجوشی ارتباط و محبت قائم کیا گیا ہے ۔

برات - بعد تبادلہ مقابل براتی اور نوشاہ اور اہل برادری بڑے ذوق سے دعوت پر بٹھائے جاتے ہیں اور نوشہ کے سامنے جو پتل رکھی جاتی ہے جب اُس کے لئے ہوتی ہے اور دوسری ہیں سے وہ تھوڑا سا کھا لیتا ہے جھوٹی پتری یعنی پس خوردہ پھر دلہن کو کھلائی جاتی ہے - دعوت کے تناول کے بعد براتی لگن کی ساعت کے منتظر پان خوری خوش فہمی محفل رقص و سرود میں مصروف رہتے ہیں - کچھ عرصہ ہوا کہ پسر والوں کے ہمراہیان کے نوجوان لڑکے ایک پارٹی اور دختر والوں کے نوجوان لڑکے دوسری پارٹی بنا کر بیت بازی کیا کرتے تھے اب یہ رواج پنجاب میں نہیں رہا - ب وقت معین پر پوجا شروع ہوتی ہے مٹی کی پیالیوں میں خشک گھاس جسے **کُشا** بولتے ہیں پھول اور خشک چاول و جو وغیرہ سے رسومات مذہبی شروع کرتے ہیں - پہلے گنیش کی پوجا ہوتی ہے پھر جگ شروع ہوتا ہے ایک آتشکدہ تیار ہوتا ہے اور آتشکدہ کے سامنے خوبصورتی سے کچھ نقش بنائے جاتے ہیں اور گورو صاحبان خوش الحانی سے سنسکرت کے اشلوک پڑھتے ہیں - افسوس ہماری قوم سنسکرت سے اس قدر بے بہرہ ہو گئی ہے کہ ایک لفظ بھی اس ساری کارروائی کا ان کی سمجھ میں نہیں آتا - یہ زیادہ افسوسناک ہے کہ اکثر گورو صاحبان بھی معنے سمجھنے سے بے بہرہ ہوتے ہیں اس آتشکدہ کے ارد گرد تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد سات "پھیرے" ہوتے ہیں یعنی دولہا اور دلہن ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے سات بار گھومتے ہیں ان کے پہلے قدم پر منجانب والدین پسر کچھ طلائی زیور یا پارچہ رکھا جاتا ہے جو دختر کو ملتی

مہاراج لیتے ہیں عموماً امیر شریفی اور اوسط درجہ کے لوگ طلائی ہڈکی رکھتے ہیں دختر کے گور صاحب علاوہ ہڈکی پسر والوں سے ایک دوشالہ یا دوشالہ کی قیمت پاتے ہیں اور علی ہذا اور کسی رقوم انکو چھوٹی چھوٹی ملتی ہیں - لگن کے کل اخراجات مثلاً سامگری روغن زرد وغیرہ بھی پسر والوں کے ذمہ ہوتے ہیں +

مستورات - اب مستورات کا حال سنئے - مستورات مردوں کے کھانا کھانے کے بعد کھانا کھاتی ہیں اُن کی نشست مردوں سے کسی قدر جدا ہوتی ہے وہان وہ چہ میگویاں کرتی ہیں اور وہ چہ میگویاں شادیوں کے **قانون** اور رقوم کے ادار کے متعلق ہوتی ہیں اور عجیب عجیب فتوے شادی بیاہوں کے متعلق حاضر و غائب اہالی قوم پر دئے جاتے ہیں - معمولی چہ میگویوں کے علاوہ مستورات کشمیری زبان میں راگ بھی گاتی ہیں جو دیگر ہندو اقوام کی طرح فحش نہیں ہوتے بلکہ پاک اور دعائیہ ہوتے ہیں +

پردہ - اس ساری کارروائی میں کل مستورات قوم کو مردوں سے پردہ نہیں ہوتا کل برادری کی عورتیں منہ کھلے موجود اور شریک شادی ہوتی ہیں - ہماری قوم میں آپسمیں پردہ یعنی گھونگٹ نہیں ہے - نہ جیٹھ اور چھوٹے دیوروں سے بھاوج اور نہ بہو اپنے سُسر سے الغرض نہ کوئی عورت کسی اہل قوم سے پردہ کرتی ہے - البتہ گھروں میں غیر قوموں سے پردہ ضرور ہے آیا اس درجہ کا پردہ کہاں تک مناسب ہے ہم ہر ایک خاندان کے بزرگ کی اپنی رائے پر چھوڑتے ہیں یعنی جن کو تنا پردہ بھی موقوف کرنے میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا وہ موقوف کردیں اور

جو کسی اندیشہ سے خائف ہیں وہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ پردہ فی الحقیقت ایشیائی قوموں کی قدیمی رسم ہے اور ضروریات وقت سے اختیار کی گئی ہے اور غالباً ضرورت رفع ہونے پر روز بروز کم ہو رہی ہے۔ مناسب درجہ تک شاید پردہ کی اب بھی ضرورت ہے۔ تناول طعام کے بعد عورتیں سب یکجا مردوں سے قدرے فاصلہ پر جمع ہو جاتی ہیں مہمان کی عورتیں اُن اشیاء کی وصولی میں مصروف ہو جاتی ہیں جو دختر کے والدین لگن کی شب کو دیتے ہیں۔ شیرینی وغیرہ کی تقسیم معمولی ہوتی رہتی ہے جس کو **حاضری** کے نام سے پکارتے ہیں۔ شیرینی کے علاوہ شیر خشک جسمیں میوہ خشک بادام پستہ وغیرہ آمیزش کیا جاتا ہے اور جسے **گوڑا** کہتے ہیں تقسیم ہوتا رہتا ہے لگن کے سات پھیروں کے بعد دولہا اور دلہن یکجا بیٹھے چاول اور دہی ایک ہی تھالی میں تناول کرتے ہیں اس موقعہ پر دختر والوں کے گھر کا خوش پز رسوئیدار اپنا حق خدمت پاتا ہے دولہا کے والدین اس کو ۳۰ سے ۶۰ روپیہ تک عموماً دیتے ہیں۔ دولہا اور دلہن کے اس موقعہ پر باہم کھانے کے علاوہ صرف ایک اور موقعہ ایسا آتا ہے پھر ساری عمر ان کو ایک تھالی میں باہم کھانا ممنوع ہے۔ **پشپ پوجا** جب لگن ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد ایک نہایت دلاویز اور پر اثر رسم ہوتی ہے جسکو **پشپ پوجا** کہتے ہیں (یعنی پھول کی پوجا) یہ رسم اس طرح ہوتی ہے کہ دولہا اور دلہن کے سر پر ایک چادر ڈال دیتے ہیں اور ایک ٹوکری پھولوں کی والدہ دختر یا ایک والد دختر کے ہاتھ میں ہوتی ہے ہر دو دولہا اور دلہن کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں اور چند گورو صاحبان شامل ہوکر موسیقی کے لہجہ میں خوش

آوازی سے باہر تعرفہ ہو کر ایک بیتک پڑھتے ہیں دریافت کرنے سے
معلوم ہوا ہے اور بعض ناموں کے ذکر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس
موقعہ پر ان نیک بخت اور وفادار بیویوں اور ان کے قدردان خاوندوں
کا تذکرہ پڑھا جاتا ہے جو ہندوستان کے پرانے زمانہ میں ضرب المثل
گذر چکے ہیں - دیوتاؤں سے دعا بدرخواست کیجاتی ہے کہ وہ اپنی روحانی
موجودگی سے برکت دیں اور ان کی بدولت دلہا دلہن کے باہمی تعلق کو
قیام ہو اور وہ ان خاوندوں اور بیویوں کی مانند کامران اور فائیز المرام
ہوں جو سابقہ زمانہ میں قابل تعظیم ہو چکے ہیں ہر ایک بید کے ختتام
پر والدین دختر دولہا اور دلہن کے سر پر پھول ڈالتے جاتے ہیں - اس
رسم پر چند گھنٹے خرچ ہوتے ہیں - جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ رسم کسی
اور مملوک قوم میں رائج نہیں اور کل شادی کی رسوم میں سے یہ رسم
مستحسن اور قابل پسند اور موثر ہے ہر ایک متنفس جو موجود ہوتا ہے اس
سے متاثر ہوتا ہے اور دست بدعا ہوتا ہے کہ جوڑا اسلامت رہے اور
خوش نصیب ہو - شیپ پوجا کے بعد دولہن کے سنگھار پر بہت وقت
خرچ ہوتا ہے - جو سہاگ پٹارہ کے سامان سے کیا جاتا ہے -

ویگو - اس کے بعد ایک مربع نقشہ رنگ آمیزی زمین پر مستورات
تیار کرتی ہیں - جسکو ویگو کہتے ہیں اس پر دولہا دولہن کو کھڑا کر دیتے
ہیں - والدین دختر ایک دوسرے کے پس خوردہ مصری کے ٹکڑے دولہا
دولہن کو کھلاتے ہیں اور ان پر سے ایک کبوتر کا جوڑا فدا کیا جاتا ہے
روپے پیسے کوڑیاں ان کے سر پر سے قربان کیئے جاتے ہیں دختر والوں
کے خاندان کی عورتیں نہایت مغموم اور چشم تر ہوتی ہیں - بعد ازاں بلات

رخصت ہو جاتی ہے +

والدِ دختر کی حالت - برات کے رخصت ہو جانے پر والدِ دختر کی حالت رحم کے قابل ہوتی ہے اس پر اپنی قوم کے بے رحم کہ جہیز کے صدمے - سمدھی کی رضامندی نارضامندی کا فکر - لڑکی کی جدائی - جہیز کی زیرباری اور لڑکی کے ساتھ آئندہ برتاؤ کا فکر اور انتظام کا تکان اور شب بیداری سب مل کر ایک دردناک حالت سر آنکھ پیدا کردیتی ہیں - وہ مجسم مایوسی معلوم ہوتا ہے +

(پنڈت بشن نرائن در)

تصویرِ قناعت

(انگریزی نظم کا ترجمہ)

شاد ہے وہ شخص جس سے دور ہیں رنج و محن — شاد ہے وہ شخص جسکے دل میں ہے حب وطن
ہے جو اُس کے پاس اک تھوڑی سی موروثی زمین — ہے اُسی میں خوش زیادہ کی اُسے حاجت نہیں
اپنے دودھ اور اپنی نان خشک میں خوشحال ہے — محنتوں کے فیض سے ہر وقت مالامال ہے
سایہ پیڑوں کا ہے گرمی سے بچانے کے لئے — آگ ہے سردی میں گرما کر سلانے کے لئے
شاد ہے وہ شخص جو ہر فکر سے آزاد ہے — جسکو اندیشہ نہیں کچھ رات دن دلشاد ہے
کٹتے ہیں آرام سے راحت سے جسکے رات دن — جسم جس کا تندرست اور قلب جسکا مطمئن
جب وہ تھک جاتا ہے محنت کرکے دن کا کام سے — رات کو سوتا ہے کس راحت سے کس آرام سے
چھوڑ کر جب بیٹھتا ہے اپنے دن کے کام کو — دیکھتا ہے بیٹھ کر پھر وہ کتابیں شام کو
رات دن حاصل ہیں اسکو رنج و راحت کے مزے — باری باری لیتا ہے آرام و محنت کے مزے
ہے میسر دولتِ آرامِ دل کا اس کو گنج — ہے اصول زندگی اُس کا مرنجان و مرنج
چاہتا ہوں زندگی ایسی ہی ہو میری بسر — رنج کی کچھ فکر ہو مجھکو نہ راحت کی خبر
یوں ہی خاموشی سے میرے نام و نشان مٹ جائیں — قبر بھی کوئی نہ ہو میری جہاں مر جاؤں میں

سرائے کا نقشہ برسات میں

دلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی صاحب جنکے دم سے داستان گوئی کے مٹتے ہوئے فن کا نام اس شہر میں باقی ہے۔ جس چیز کا بیان کریں اس خوبی سے کرتے ہیں۔ کہ کہا جا سکتا ہے وہ لفظوں میں مصوری کرتے ہیں۔ ذیل کا مضمون ایک ظریفانہ کہانی کا جزو ہے ہماری درخواست پر انھوں نے اسے قلمبند کر دیا ہے۔ اس میں بھولے بھٹکے مسافر کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جو کسی معمولی سرائے میں برسات کے موسم میں جا پھنستا ہے:۔

بارش ہو رہی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ خدا خدا کرکے سرائے کی صورت نظر آئی۔ بے ڈول سنگ خارا کے ٹکڑے اور مٹی سے چنتے ہوئے دروازے کے پاکھے بانس کے کواڑ۔ جو بان سے بندھے ہوئے ہوا کے جھونکے سے کبھی بسار ئیکے پیڑ سے ٹکرا آتے ہیں اور کبھی بھیگی ہوئی گرنے والی دیوار کو صدمہ پہنچاتے ہیں بیلوں کے کھروں سے روندا ہوا گوبر سیاہ سڑی ہوئی مٹی سانیکی گھاس پھوس کے تنکے ملگجے جھاگ کیچڑ سا کالا پانی دروازہ سے بہتا ہوا چلا آتا ہے اور ایک مٹی کی ٹونٹی اور کنارہ ٹوٹی ہوئی بدھنی کبھی اوندھی اور کبھی سیدھی ہو کر پانی کے ساتھ ساتھ لڑھکتی ہوئی چلی آتی ہے۔ مسافر بھیگا ہوا لباس پہنے ہوا کے سرد جھونکوں سے دل کانپ رہا تھا ہونٹ نیلے ہو گئے تھے مگر لوگوں کے ہنسنے کے خیال سے تھرتھری کو ضبط کر ٹٹو کو بڑھا اندر آیا تو

دیکھا کہ سرائے کے بیچ میں ایک کنواں ہے کہل پانی ستے ہوئے اور آتی
رہی ہے سارے صحن میں ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ بھیسول چکر
جیسے پرانی سرکیاں اور بھیگے ہوئے دولڑے پڑے ہیں ۔ پر
ٹاٹ اور پرانی گدڑی کی جھولیں بھیگی ہوئی پڑی ہیں جیسے پانی کی
بوندیں ٹپک رہی ہیں چھکڑے والے بھیگے ہوئے پتھروں سے چولہے
بناتے گیلے ہوئے ایندھن کو پھونک رہے ہیں دھواں اٹھ رہا ہے
چہرہ سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں بھرتیوں میں دال پڑ رہا
رہی ہے لوہے کی پراتوں میں چنے کا سا آٹا گوندھا ہوا ہے چار طرف
نکلے ہوئے سیاہ پھونس کے چھپروں کا جگہ جگہ سے پھونس سٹ گیا ہے
اور دھوانس لگے ہوئے بانسوں کا ٹھاٹر اور پرانے بان کے بند
نظر آرہے ہیں کسی پر مٹکے کا ٹھیکرا اور کہیں پیندا نکلا ہوا کونڈا ڈھکا ہے
ان چھپروں پر نیم کے درخت کا سایہ ہے ان پر زرد زرد پتیاں اور
سوکھے ہوئے نیم کے تنکے کوؤں کی گرائی ہوئی ہڈیاں جو بارش سے
پھول گئی ہیں کچھ کھمبیاں جنکو عام لوگ بلی کا موت کہتے ہیں چھپروں
پر نکلی ہوئی ایک طرف کو بڑے چھپر کے نیچے بھٹیاری بیٹھی بڑبڑا رہی
ہے جس کا کالا رنگ اوپلا سا چہرہ چندھیاں سی آنکھیں چپٹی ناک گردا
سے ہونٹ اور موٹے موٹے ہاتھ پاؤں سر میں سرسوں
کا تیل جو مسافروں کے چراغوں سے بچا ہے پڑا ہوا مینڈھیاں گوندھی
ہوئیں جنمیں موباف کی جگہ دیسی سوت کا کلاوہ زرد و سرخ پڑا ہے
بندھے ہوئے بالوں میں مٹی اٹی ہوئی ہاتھ گلے میں پیتل کانسی چاندی کا
زیور انوٹ بچھوے چنگری ہنسلی بکیاں سیلے چھلے چھپیا گجری

متی - چوکرا - مُرکی - بُندا - کنگن - پائل - ایڑی تک آرا - تمیل - ...
... من مالا - پچلڑا - ستلڑا - چمپاکلی - چندن ہار - چمپن - پچھیلی بازو بند - ٹیکہ
... سر پر قند کا سرخ دوپٹہ لال تکا - نیلی سوزی کا پیجامہ - ... کی
... ریشم کی کمر بال بنی ہوئی - داہنے ہاتھ کی طرف سے کھلے
ہوئے ... وجا من کے پتے دس بارہ گرہ کی دونوں طرف سے جلتی
ہوئی لکڑی جسے کوڑا جھونک رہی ہے - آگ کے چولہے پر کلا ٹوٹے
ہوئے مٹکے کا پیندا رکھا ہے جس پر کئی روٹیاں ڈال دی ہیں ہاتھ بھر
پیڑا ہے کسی ہانڈی میں ڈوئی چلاتی ہے کسی کا نمک چکھا ایک مسافر
چولہے کے آگے بیٹھا روٹیاں سینک رہا ہے - کسی کا بچہ رو رو کر روٹی کا
تقاضا کر رہا ہے میاں بھٹیارے ایک طرف کسی کا حقہ جس پر پانی کا
نیچہ بندھا ہوا کپڑے کی جگہ بان لپٹا ہوا مٹی کی چلم اونٹ کی مینگنی کی
آگ سے بھری ہوئی کھانس کھانس کر دم لگا رہا ہے - ہم بھی پہونچے
بی بھٹیاری ہم کو کوئی جگہ بتا دو -

بھٹیاری - میاں مسافر وہ سامنے کی کوٹھری خالی ہے -

میں - ٹپکتی تو نہیں -

بھٹیاری - ٹپکنے وپکنے کی تو خبر نہیں -

میں - وہاں آیا تو دیکھا گیلی کوٹھری دو کڑیاں چھت کی چپٹی ہوئی جا بجا
جگہ جگہ ٹپکا لگا ہے اور زمین میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے ہیں
دھوانس کا سرخی مائل بو دار پانی جمع ہے جب بوند پڑتی ہے تو چاروں
طرف پانی اُچھلتا ہے -

مسافر - میاں مہتر جی یہاں آؤ -

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاید اسی موقع کے لیے [illegible]

[illegible] مسافر غریب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

روپیہ پیسہ کے معاملات

[illegible]

[illegible] thrift [illegible] کے معنی [illegible] کی پابندی [illegible]

[illegible] اقبال مندی [illegible] پیشتر اس کے کہ کوئی چیز خریدیں [illegible] ہو سکتا ہو [illegible]

[illegible] دولتمندی [illegible] آئندہ کی ضروریات [illegible] عقلمندی کا کام [illegible] اور [illegible] وقت تنگدستی [illegible] افسوس [illegible] بیوی بچوں [illegible] آرام کی قدرت [illegible] اگر ہم شروع عقل سے محنت کریں [illegible] ضروری خواہش کے پورا کرنے سے نفس کو روکتے

[illegible] Thrive [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کیا ہے [illegible]

[illegible] علیہ السلام [illegible] کہ انسان کچھ بھی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مرغوب [illegible]

[illegible]

[illegible]

کہ [illegible] اور [illegible] کے [illegible]

بیں اور انہیں کی [illegible] ہے عظیم [illegible] ہوا ہے جس سے

انسان کو [illegible] اور [illegible] حاصل ہوئی ہے جنھوں نے [illegible]

[illegible] وہ ان لوگوں کے غلام ہو گئے

[illegible]

[illegible] اول کو [illegible]

[illegible] سے زیادہ [illegible]

[illegible] ہوتا ہے ۔

[illegible] نے لکھا [illegible]

[illegible] اگر کوئی [illegible] ہوتا تھا

[illegible]

[illegible] اور [illegible] وہ

[illegible] آرام کرتے ہیں [illegible] ان کو [illegible]

عزت نصیب ہو۔ اس قسم [illegible] نکالا کہ [illegible]
[illegible] ان میں [illegible] [illegible]
قرض [illegible] کوئی [illegible] تو روپیہ معطل [illegible]
حاصل ہوتا ہے [illegible]
جس قدر روپے کھو [illegible]

۸ - اگر دولت [illegible] ہو [illegible]
اس کی مثال ایک معمولی [illegible] ہے [illegible]
ابتدا میں دولت کی [illegible] ہو تو [illegible] سب [illegible] کر [illegible] چاہیے [illegible]
حاجت کے [illegible] بھی کرنی چاہیے میرا خیال [illegible] ہمیشہ [illegible]
دراز ہوتا ہے اور [illegible] کے ساتھ [illegible]
پڑتی ہے [illegible] کاروبار میں نقصان [illegible] زیادہ [illegible]
[illegible] ان کے [illegible] حال [illegible]

۹ - [illegible]
دام ہے [illegible] حاصل نہ ہوسکے تو وہ [illegible]
[illegible] جائے گی۔

۱۰ - [illegible] کے لیے [illegible] درست [illegible]
[illegible] سمجھتے ہیں [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] اکثر [illegible] یہ ہے کہ [illegible]
[illegible] لیکن [illegible] ہے کہ [illegible]
[illegible] آتا ہے [illegible] دولت [illegible]

۱۱ - [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۲۵ [illegible]

[illegible] الٰہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دینا چاہئے [illegible]

[illegible] اتفاق ہوتا ہے کہ ہم ہر پہلو سے [illegible]
لگاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا نکلتا ہے کہ بڑے [illegible]
جو قتل سے پہلے ہوتے ہیں غلطی کر بیٹھتے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
میں ہر ایک [illegible]
[illegible] کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ جو کام کرو آرام سے کرو۔ کہتے ہیں کہ [illegible]
تصویر کھینچا کرتا تھا تو کچھ نہیں سوچتا تھا۔ اس کا [illegible]
تصویریں سب [illegible]

۱۶۔ [illegible] بہت سے آدمی [illegible]
میں اس لئے [illegible]

۱۷۔ ہم ماتیں یا [illegible] ہم میں سے ہر ایک [illegible]
[illegible] ہے۔ ہر ایک کے کچھ نہ کچھ فرائض ہیں [illegible]
[illegible] پڑتا ہے۔ انہیں مصارف کا انتظام کرنا [illegible]
بڑے بڑے کاموں میں الجھنیں ہوتی ہیں [illegible]
اسی طرح چھوٹے چھوٹے کاموں کا بھی حال ہے۔

۱۸۔ خوش قسمتی سے کاروبار میں کامیابی [illegible]
[illegible] احتیاط اور توجہ پر ہے [illegible]

دونوں کی کمائی ... دونوں تمہاری رکھوالی کرے گی۔ اور جب تم
اپنی عادت بنا لو گے کہ اپنے کاروبار میں سرگرمی سے محنت کرو تو نتیجہ
یہ ہو گا کہ تم مالا مال ہو جاؤ گے۔ ... ایک کہاوت اس کی
تائید ... ایران کے بادشاہ نے پوچھا کہ گھوڑے
موٹے ... جلدی ... کرنے کے لئے واقف کاروں سے
... ایسی ہے جس سے کوئی گھوڑا بہت ہی جلدی فربہ
... مالک کی نظر، اپنی توجہ یا خبرگیری۔

۱۹۔ کاروباری آدمیوں کی عادات پر نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے تھوڑی
... میرے ایک ممتاز دوست نے مجھے اس امر کا یقین
دلایا ... قابل اور ... اصحاب کی ناکامیوں پر غور
کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ عموماً ناکامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ منہا دینے
... کاروباری نہ تھے یا مرد کار دان نہ تھے۔

۲۰۔ جس طرح ... معاملات میں ترتیب اور نظام کی بہت ضرورت ہے
... اشیا کو قرینے سے رکھنا چاہئے۔ یہ قاعدہ
... یاد رکھنے کے قابل ہے جب ہم کسی شئے کو کام میں
... جگہ پر رکھ دیتے ہیں ذرا تکلیف تو ہوتی ہے لیکن
وقت ضرورت اسے بہت آسانی سے نکال سکتے ہیں +

۲۱۔ ... اپنی کتاب موسومہ "علم خانہ داری" میں لکھتا ہے۔
... بے ترتیبی کی مثال یہ ہے۔ ایک کسان اپنے گھر
میں جو ... اور ... ڈال دیتا ہے جب اُسے جو کی روٹی
گندم کی روٹی کی ضرورت ہوتی ہے یا مٹر کے شوربے کی حاجت ہو

تو ایک ایک دانہ چن چن کر جمع کرتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ہر جنس کی وقت حاجت کام آنے کے لئے جدا گانہ رکھتا ۔

۲۲ - ایک بہانہ کی مثال دیگر زینوفن لکھتا ہے کہ جب سمندر میں خدا طوفان برپا کر دیتا ہے نہ تو کارآمد اشیا کے تلاش کا وقت ملتا ہے نہ بے مصرف چیزوں کے پرے پھینکنے کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتگان عذاب نافرمانوں کو مرعوب و مغضوب کرنے میں اگر وہ ان اشخاص کو تکلیف دینے سے باز رہیں جو کسی غلط کاری کے مرتکب نہیں ہوئے تو ہم کو ان پر قناعت کرنی چاہئے یہانتک کہ اگر وہ ان شخصوں کو محفوظ رکھیں جو ہر امر کو درستگی سے ادا کرتے ہیں تو بھی وہ بہت شکریہ کے مستحق ہیں" پس لازم ہے کہ ہر شئے کو قرینہ سے رکھا جائے ۔

۲۳ - اکثر حکیموں نے ارسطو سے لیکر کارلائل تک تجار بلکہ خود تجارت اور حرفت کو قابل نفرت اور باعث رذالت تصور کیا ہے افلاطون کے خیال کے بموجب جمہوری سلطنت میں تجار حقوق رعایا سے خارج تھے ایسا رذیل پیشہ اجنبیوں کے حوالے کیا جاتا تھا بشرطیکہ کوئی اسے اختیار کرنا چاہے۔ چونکہ اکثر لوگ تجارت اور حرفت میں مشغول ہوتے ہیں۔ اگر ان کا اثر عملی زندگی پر مضر ہوتا تو بڑی آفت آتی شکر کا مقام ہے کہ ایسا نہیں ہوتا اسمیں کلام نہیں کہ کاروباری آدمی دیگر مشاغل کے لئے فالتو وقت ہی دے سکتے ہیں لیکن صرف علم حقائق و قوانین مسلمہ مرتبہ (سائینس) اور علم ادب (لٹریچر) سے ہی مثالیں ڈھونڈیں تو سن لیجئے نیسنتھ ہیئت دان بھی تھا اور دستکار بھی تھا۔ گروٹ ساہوکار بھی تھا اور مورخ بھی تھا۔ سر جے۔ الیوس

کاغذ ساز تھا اور مجلسِ محققین آثار صنادید (کا میر مجلس بھی تھا) علاوہ بریں۔ شاہی مجلس کا خزانچی بھی تھا۔ پریسٹر پچ سوداگر تھا بعدہٗ آکسفورڈ میں علم طبقات الارض کا پروفیسر بن گیا تھا۔ روجرس اور پریڈ ساہوکار بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ اگر اجازت ہو تو یہ بھی عرض کروں کہ میرے والد صاحب ساہوکار بھی تھے اور ریاضی دان بھی اور کئی سال تک رائل سوسائٹی کے خزانچی اور وائس پریسیڈنٹ (نائب میر مجلس) رہ چکے ہیں۔ ان کے سوا اور کئی مثالیں موجود ہیں۔

۴۲۔ کارلائل اس اصول کی سخت مخالفت کرتا تھا کہ اشیا سستی سے سستی منڈی میں سے خریدنی چاہیئے اور جہاں اُنکی قیمت زیادہ سے زیادہ دستیاب ہو وہاں فروخت کرنی چاہیئے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ ہم کو لازم ہے کہ اشیا کی اقل قیمت مقرر کردیں۔ گو اس کے جواز میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ سیئے ہم یہ کہیں کہ بس اس چیز کی یہ قیمت ٹھہرے گی۔ اس سے کم نہ ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کو چاہیئے کہ دوسری قوموں کی بہ نسبت کم قیمت نہ لیں۔ اور ان کے برابر قیمت لینے پر قناعت کریں۔ جائے غور ہے کہ یہ اصول نہ صرف محال بلکہ ناجائز ہے۔ اگر اشیا کی بکری کم ہوگی۔ اشیا خوردنی کم ہاتھ آئیں گی۔ کارلائل اس بات کو مانتا ہے کہ کم قیمت پر فروخت ہونے سے زیادہ مال بک سکتا ہے۔ پس اگر اس کے دستور العمل کے موافق کام کیا جائے تو ایسے انسان بھی ہونگے جن کو کپڑے کی ضرورت ہوگی لیکن مقررہ قیمت دینے کی توفیق نہ رکھتے ہونگے۔ گو ہم کم قیمت لے سکتے ہوں۔ لیکن وہ ہمیں ایسا نہیں کرنے دینگے۔ اس طرح سے

لوگوں کو کپڑا میسر نہ آئیگا اور ہمارے لوگوں کو خوراک نہ ملیگی۔ تجارت
کا اصل اصول یہ ہے کہ جو چیز تم کم قیمت سے پیدا کر سکو وہ مگر جس چیز کی
اشد ضرورت ہو اُسے خرید لو۔ نیز اشیا کا سستی سے سستی منڈی میں سے
خریدنا اور جہاں اُن کی زیادہ سے زیادہ قیمت دستیاب ہو فروخت کرنا
نہ صرف تجارت کا ضروری قاعدہ ہے بلکہ ہر شخص کے لئے از بس مفید ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح عمل کرنے سے جن اشخاص کو بیشی مال کی
بکری از حد مطلوب ہوتی ہے اُن کا مال بک جاتا ہے۔ اور جن کو اسباب
کی نہایت ضرورت ہوتی ہے اُن کے ہاتھ مال فروخت ہو جاتا ہے۔
اس اصول کے خلاف عمل کرنا ایسا ہے جیسا کہ (انگریزی ضرب المثل کے
موافق) نیو کاسل میں کوئلے لیجانا (اور مشرقی خیال کے بموجب باغ میں
پھول لیجانا) +

۲۵ - ایسا اتفاق ہو چکا ہے کہ اکثر اصحاب جو رکن رکین اور از بس خوش
اور وسیع خیال کئے جاتے تھے بہت غریب تھے۔ ورڈسورتھ اور اس
کی ہمشیرہ کئی سال تک تیس شلنگ ہفتہ وار پر گزارہ کرتے رہے اور
میں یقین کرتا ہوں کہ زندگی میں یہ زمانہ اُن کے لئے انتہائے انبساط سے پُر تھا

۲۶ - اگر دولتمند ہونا تمہاری قسمت میں نہ ہو تو ارتباط خیالات اور
محبت کے ذریعہ سے کوئی جگہ جو اپنی سادگی لئے ہوئے ہو یا چھوٹی
سی جھونپڑی یا کوئی خوش کن چہرہ تمہارے لئے دنیا بھر کی نعمت ہو سکتا ہے۔
علاوہ بریں بقول بیکسٹر "گو دنیا کی سلطنتیں مفلوک الحال اشخاص
کے لئے نہیں - آسمان کی بادشاہت تو ممکن ہے کہ اُن کا مال ہو سکے"

۲۷ - حقیقت میں بڑے تعجب کی بات ہے کہ کتنے جلیل القدر آدمی مفلس

تھے۔ اور حضرت محمدؐ صاحب کے زمرہ کا تو کیا ذکر ہے کہ "خدائے تعالےٰ ہمیشہ رسولوں کا انتخاب جھیڑوں کے باڑے سے کرتا تھا"

۲۸۔ عام لوگ مبالغہ سے کہدیتے ہیں کہ جو کچھ ہے روپیہ ہی ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا روپیہ سے خوراک میں کشائش ہوتی ہے؟ سر ہیلپس کا مقولہ ہے کہ "اگر کسی آدمی کو صحت مطلوب ہو تو اسے لازم ہے کہ غریبوں کی طرح زندگی بسر کرے۔ صبح کے ناشتہ کے لئے چاء یا کافی ہو۔ مکھن روٹی اور بقدر ضرورت انڈا یا مچھلی اور قدرے شہد کے سوا اور کیا ہو۔ تیسرے پہر کے ناشتہ کے لئے روٹی اور پنیر اور جو کی شراب کا ایک گلاس کافی ہے۔ سادہ وضع کا طعام اگر عمدگی سے پکایا ہوا ہو۔ اور اشتہا خوب ہو تو ایسی ہی خوشی حاصل ہوسکتی ہے جیسی کہ کسی لارڈ میر یا بڑے مجسٹریٹ یا امیر کبیر کی ضیافت میں۔ جو اشیاء خوردنی تہ سے عمدہ اور نہایت خوشگوار ہوتی ہیں اپنے موسم میں نسبتاً کم قیمت کو میسر ہوسکتی ہیں۔ اور اگر بے موسم ہوں تو بدمزہ ہوتی ہیں بعض اوقات انسے کی بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے خاصی ضیافت ہوسکتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ" اچھا اب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا روپیہ سے مطالعہ کتب میں مدد ملتی ہے؟ حقیقت میں وہ آدمی غریب ہے جس کو مطالعہ کے لئے اتنی کتابیں چاہئیں جنکی خرید کی اسے مقدرت نہیں۔ اچھی سے اچھی کتابیں یعنی انجیل مقدس۔ تصانیف شکسپیر اور ملٹن وغیرہ اب بقول شخصے کوڑیوں کے مول بکتی ہیں۔

۲۹۔ تو پھر روپیہ کس مصرف کی چیز ہے؟ کیا اس سے صحت دستیاب ہوسکتی ہے یا ذکاوت مل جاتی ہے۔ احباب۔ خوش وضع یا منتظم گھرانہ

آخر اس سے کیا ملتا ہے؟ +

۳۰۔ کیفوسشن کہتا ہے کہ "ڈیوک آف ... بہت ہی مالدار تھا۔ لیکن کسی کو اس سے محبت نہ تھی ... کوئی قدر ... مر گیا تھا۔ لوگ اب تک اس کا ماتم کرتے ہیں"

۳۱۔ سب باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ بقول ایڈورڈ ینگ ... شاعر، "کیا دولت سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ اپنے گرد نظر ڈالو اور دیکھو کس قدر مصیبت پھیلی ہوئی ہے جو خوشی کی آڑ میں پوشیدہ ہے۔ اس قدر ... آئی ہوئی ہے جو بظاہر شان و شکوہ کا تاج لئے ہوئے ہے۔ میں کسی ظاہری رونق پر رشک نہیں کرتا۔ نہ ہی میں دوسروں کی طرح ملمع کی خوشی چاہتا ہوں۔ جو در حقیقت افسردگی ہوتی ہے" +

۳۲۔ بیکن کہتا ہے کہ "اصحاب دول کو اپنی سُدھ بُدھ نہیں ہوتی جب کاروبار کی سرگردانی میں ہوتے ہیں تو اپنی روحانی یا جسمانی صحت پر توجہ ہونے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے" + ایک پرانی اطالوی ضرب المثل ہے کہ "غریب گھر۔ بڑا آرام"

۳۳۔ بیڑیاں کبھی اچھی نہیں ہوتیں خواہ سونے کی ہوں۔ حقیقت میں یہ تردد کی جڑ ہے + جیسے افلاس میں تفکرات ہوتے ہیں متمول میں بھی ہوتے ہیں اور کئی مالداروں کا یہ حال ہے کہ وہ در حقیقت روپیہ کے مالک نہیں بلکہ غلام ہوتے ہیں + بقول بیشپ ولسن "دولت دولتمندوں کے لئے نہ صرف باعث فکر بلکہ عذاب ہو جاتا ہے"

۳۴۔ فی الحقیقت دولت نے کئی آدمیوں کا ... کر دیا ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ امیر غریبوں کی نسبت روپیہ کے معاملات میں غالباً زیادہ تر تردد

ہوتے ہیں۔ دولت سے عقلمندوں کے سوا کسی کو خوشی میسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص دولتمند ہونے کے لئے ضرورت سے زیادہ کوشش کریگا وہ ہمیشہ بے خبر رہیگا۔ رسکن کہتا ہے کہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہنا اور کسی عالیشان مکان کو دیکھ کر متحیر ہونا۔

میرے خیال میں اس عالیشان محل کا جس میں زیادہ تر باعث مسرت ہے۔ کیونکہ آخری صورت میں کوئی شے نہیں ہوتی جو ہمارے تحیر کے لئے غذا بن سکے۔

۳۵۔ دولت کا لطف اٹھانا ہو تو اس سے دل بستگی پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے هذا المقدار یحملك وما زاد على ذلك فأنت حامله (یعنی اس قدر ترا برپیے دارد و ہر چہ بریں زیادت کنی تو حمال آنی)۔

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

غم موجود و پریشانی معدوم ندارم نفسے میزنم آسودہ و عمرے بسر آرم

۳۶۔ بیکن کا قول ہے کہ اس دل پر کس قدر مصیبت ہوتی ہے جس کی خواہشیں تو بہت کم ہوں لیکن اس کے خطرات کثیر ہوں۔" شکسپیر کہتا ہے "اگر تو دولتمند ہے تو یہ جان لے کہ تو غریب ہے۔ کیونکہ تو گدھے کی طرح جسکی پشت سونے چاندی کے بوجھ سے خمیدہ ہوگئی ہو تو صرف ایک منزل تک مال و دولت لیجاتا ہے اور موت تیرا بوجھ ہلکا کر دیگی۔" انگریزی شاعر جونسن کہتا ہے "ہم کیوں فکر میں جان ماریں اور کیوں آئندہ کے لئے خزانے جمع کریں کیا بیماری کی مصیبت میں یہ خزانے ہمارے ماندہ دل کو خوش کر سکتے ہیں یا ان سے آرام کی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا بستر مرگ پر روپیہ سے ایک لمحہ زندگی بڑھ سکتی ہے؟ یا جان کنی کے اضطراب میں تخفیف ہو سکتی ہے؟"

(باقی آئندہ)

چند گھنٹے لورپول میں

سفر ٹرکی میں بیشمار اصحاب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ بیتے انگلستان میں شیخ عبداللہ کوئیلم (شیخ الاسلام جزائر برطانیہ) سے بھی ملاقات کی یا نہیں اور اگر کی تو میری رائے اُن کی نسبت کیا قائم ہوئی۔ اور یہی سوال جب سے میں ہندوستان میں آیا ہوں دُہرایا گیا ہے۔ اس لئے اس مختصر سی ملاقات کا حال جو مجھے شیخ ممدوح سے ایک مرتبہ نصیب ہوئی خالی از دلچسپی نہ ہوگا میں نے لندن سے بعض معاملات کے متعلق شیخ عبداللہ کوئیلم سے خط وکتابت کی تھی اور انہوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ لورپول جاکر ان کے ہاں ٹھہروں لیکن اُس کا موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ میں اتفاق سے مانچسٹر میں مقیم تھا۔ کہ ایک دن فرصت کا نکل آیا اور یہ معلوم ہُوا کہ لورپول وہاں سے قریب ہی ہے اور گاڑیاں بکثرت جاتی ہیں۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر میں روانہ لورپول ہوا۔ اتنا تامل ضرور تھا کہ بے اطلاع جاتا ہوں۔ خدا جانے شیخ ممدوح وہاں ہوں یا نہ ہوں۔ یا انہیں فرصت ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن چونکہ دوسرے موقعہ کا ملنا غیر متیقن تھا۔ جانا ہی مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے شیخ لورپول میں ہی تھے اور اپنے دفتر میں مل گئے اور حسن اخلاق سے باوجود کم فرصتی کے اور باوجود کسی ملاقاتی کی آمد کے لئے تیار نہ ہونے کے وہ پیش آئے اُس کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ہے +

مجھے اُن کے کاروباری دفتر کا پتہ معلوم تھا جہاں وہ سالسٹر کا کام

کرتے ہیں۔ شہر کے کامیاب سالسٹروں میں اُن کا شمار ہے۔ اور اُن کے وقت کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ کام سے فرصت کا وقت نکلتا ہے۔ اسے آپ اپنے مذہب کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ میں جب گیا تو وہ ابھی دفتر میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اُن کے آدمی نے مجھے وہاں بٹھایا۔ اور کہا کہ ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تشریف لے آئے اور میرا کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلایا۔ نہایت خوش ہو کر ملے مگر شکایت کی کہ میں نے اُنہیں پہلے سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرا آنا اتفاقی ہو گیا اور میں بہت تھوڑے سے وقت کے لئے آیا ہوں۔ اس لئے اسے اس آنے میں محسوب نہ کیا جاوے جس کا وعدہ تھا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اس وقت بھی خیر مقدم کہتا ہوں اور پھر آپ آئیں گے تو پھر کہوں گا اور میری خوشی یہ ہے کہ آپ کم از کم دو تین دن کے لئے آئیں اور کوئی تعطیل کا دن درمیان ہو تو میں آپ کو جزیرہ میں لے چلوں۔ جہاں میرا گھر ہے اور جہاں اب ہم نے ایک مختصر سا اسلامی مدرسہ و یتیم خانہ بھی بغرض سہولت منتقل کر دیا ہے۔ میں خود اکثر وہاں چلا جاتا ہوں۔ اور وہ جگہ بہ اعتبار صحت بخش آب و ہوا کے اس کارخانوں سے بھرے ہوئے۔ اور دھوئیں سے گھرے ہوئے لورپول پر قابلِ ترجیح ہے۔ میں نے بھی جزیرہ کو دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اور کہا میں کوشش کرونگا کہ پھر آؤں اور وہاں کی سیر کروں لیکن آج یہاں دو غرض سے آیا تھا۔ ایک آپ کی ملاقات سو حاصل ہوئی دوسرے آپ کے اسلامی عشق کے کام کا جو حصہ یہاں نظر آ سکتا ہے اُسے یا آپ کی معیت میں دیکھنا یا آپ کے کسی معتبر کے ساتھ جا کر دیکھنا۔ انہوں نے کہا جو کچھ یہاں موجود ہے۔ وہ میں خود ساتھ چل کر آپ کو دکھلاؤں گا۔

اب یہاں صرف ہمارے مسلم انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے۔ اس میں ایک بڑا کمرہ ہے۔ جو لیکچروں کے لئے ہال کا کام دیتا ہے اور جمعہ کے دن مسجد کا کام۔ اگر آپ جمعہ کے دن تشریف لائیں تو پچاس ساٹھ نمازیوں کی جماعت آپ کو ملے گی۔ ہمارے رجسٹر پر مسلموں کی تعداد کئی سو تک پہنچ چکی ہے۔ مگر ان میں سے بعض فوت ہو گئے۔ بعض کہیں دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ اب بھی کوئی تین سو کے قریب انگریز ہوں گے جو یہاں اور اس کے گرد و نواح میں ایسے ہیں جو ہماری جماعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے جو جمعہ کے دن شہر میں ہوتے ہیں وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر لیکچر کا دن اتوار کا ہے۔ اس دن زیادہ مجمع ہوتا ہے۔ اور لیکچروں کے سننے کے لئے غیر مسلم بھی آتے ہیں۔ اور بارہا یہ ہوا ہے کہ وہ لیکچروں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ داخل سلسلہ ہو گئے ہیں۔

میں نے سوال کیا کہ یہ تو فرمائیے کہ آپ جب اشاعت اسلام کرتے ہیں یا فرائض اسلام ادا کرتے ہیں تو اب بھی لوگ آپ پر اینٹ پتھر پھینکتے ہیں یا نہیں جیسے پہلے دنوں میں کیا کرتے تھے؟

جواب: اب وہ نوبت نہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا تعصب ابھی دور نہیں ہوا۔ گو ابتدا میں جو ہجوم ہوتا تھا اور جو اذیتیں ہمیں دی جاتی تھیں ان سے نسبتاً امن ہے۔ میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لیتا ہوں اور انہیں خواہ مخواہ چھیڑ کا موقع نہیں دیتا۔ (اپنی انگریزی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے) دیکھئے میں عموماً یہی ٹوپی اوڑھتا ہوں۔ اور فوراً ان لاکھوں انگریزوں میں مل جاتا ہوں جو شہر کے کوچہ و بازار میں پھرتے ہیں اور جن سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ کون جانتا ہے کہ یہ کوئیلم جا رہا ہے اور بہت سے کوئیلم جاننے والے ایسے بھی ہوں گے جو یہ نہیں جانتے کہ یہ عبداللہ

کونٹلم ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے میرے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کہکر کہ اس شخص کے حواس میں خلل آگیا ہے جو اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے۔ جب میں نے اُسے کوشش اور محنت سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سیکرٹری کے کام کے لئے میں وہی کونٹلم ہوں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے تھا۔ تو کاروبار کی پہلے کی سی حالت قائم ہوئی۔ اب میں اپنی اسلامی وردی صرف جمعہ کے دن پہنتا ہوں اور باقی دنوں میں مشغل اور لوگوں سے رہتا ہوں "

دریول جانے سے پہلے میں نے شیخ کی ایک تصویر ترکی علماء کے لباس میں دیکھی تھی اور یہی اُن کی وقت نماز کی وردی ہے۔ شاید اس لئے اور ڈھیلے لباس کی وجہ سے ہوگا کہ وہ خلاف قدآور معلوم ہوتے تھے۔ مگر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ ان کی صورت زیادہ تیزی کا پتہ نہیں دیتی۔ مگر آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ ان کا روزمرہ کا لباس انگریزی مذاق کے اعتبار سے بھی بہت سادہ ہے۔ اور وہ بہ نسبت خوشحالی کے قریب قریب درویشانہ زندگی بسر کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی گفتار میں بھی وہ بات نہیں جو اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ گو طاقت زبان معمولی گفتگو میں بھی موجود ہے۔ اُن کا تلفظ اور لہجہ اس علاقہ کا تلفظ اور لہجہ ہے جس میں وہ رہتے ہیں۔ یہ بات شاید عام طور پر معلوم نہیں کہ انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی مختلف حصوں کے تلفظ اور لہجہ میں فرق ہے۔ چنانچہ مانچسٹر اور لورپول وغیرہ میں ایسے الفاظ کو جن میں حرف بالفتح پڑھا جاتا ہے۔ بالضم بولتے ہی ہیں۔ مثلاً "کپ" یا پیالہ کو "کُپ" اور "فن" یا ہنسی۔ تماشا کو "فُن" کہتے ہیں اور ہمارے شیخ کوئلم بھی اس تلفظ

کے عادی ہیں +

دفتر میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد شیخ مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ کھانے پر مختلف اسلامی مضامین کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جن سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شیخ کا دل حقیقت میں نور اسلام سے منور ہے۔ وہ جو خدمت اسلام کی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں خلوص سے کرتے ہیں اگر اُن کو سلطان المعظم کے ہاں سے کچھ امداد ملتی ہے یا وہاں اُن کی خدمات کی قدر کی گئی ہے۔ تو یہ اُن کی خوش قسمتی اور سلطان کی بیدار مغزی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ امداد یا قدر دانی اُن کی مساعی کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی مساعی اُن کے دلی عقیدے کا نتیجہ ہیں۔ اور یہی وہ رائے تھی جو میں نے اُن لوگوں کو دی جنہوں نے جابجا شیخ کی نسبت مجھ سے استفسار کیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ شیخ عبداللہ کوئیلم کے پکے مسلمان ہونے کی ایک اور شہادت بھی مجھے ملی ہے جو قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مجھے لندن میں اُن کے چھوٹے صاحبزادے مسٹر بلال کوئیلم سے ملنے کا اتفاق ہوا جو باپ کے پیشے کی سند حاصل کرنے کے لئے لندن میں پڑھتے ہیں اوّل تو اس نام سے ہی پیغمبر اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ دوسرے اُن کی تقریر جو اسلام کے متعلق سنی تو جی خوش ہو گیا اور معلوم ہوا کہ باپ نے خاص توجہ سے بیٹے کو اپنے مذہب سے آگاہ کیا ہے۔ اور یہ بات بغیر خلوص کے ممکن نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پہلے مسلمانان لیورپول کی قبور دیکھنے گئے۔ کوئی پچیس تیس قبریں ہونگی جو وہاں کے عیسائی قبرستان کے ایک گوشے میں بنی ہوئی ہیں اور دیگر قبور سے صاف نظر آ رہی ہیں کیونکہ قبلہ کے لحاظ کی وجہ سے ذرا آڑی بنی ہیں اور دوسری قبروں کی

سیدہ میں نہیں۔ شیخ نے سنایا کہ وہاں مسلمانوں کو دفن کرنے کے متعلق بہت جد و جہد کا سامنا ہوا تھا اور بہت جھگڑے کے بعد وہ زمین جس میں انگلستان کے ان اولین مسلمانوں کی قبریں بنی ہیں۔ مسلمانوں نے مول لے لی تھی۔ یادِ رفتگان سے شیخ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ کیونکہ ان سونیوالوں میں بہت سے ان کے رفیق و مونس تھے جنہوں نے ابتدائی تکالیف کے مقابلہ میں انکا ساتھ دیا تھا۔ اور ہم نے فاتحہ کیلئے ہاتھ اٹھائے کہ خدا ان سب کی ارواح پر رحمت فرمائے۔

قبرستان سے ہم انسٹی ٹیوٹ کی طرف آئے۔ مختصر سی عمارت ہے جو موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ سہ منزلہ ہے۔ داخل ہوتے ہی دفتر کا کمرہ ہے۔ اُس کے آگے ہال کا بڑا کمرہ۔ ہال میں کوئی تصویریں یا دیگر آرائش نہیں۔ صرف ایک چبوترہ تقریر کے لئے بنا ہے اور نیچے کرسیاں رکھی ہیں۔ نماز کے وقت کرسیاں اٹھا دی جاتی ہیں۔ چبوترہ کے ساتھ کی دیوار پر جلی حروف میں امیر عبدالرحمان خان مرحوم کے گرانبہا عطیہ کا ذکر ہے جو پرنس نصر اللہ خان کے ہاتھ لورپول کی اسلامی جماعت کو دیا گیا تھا اوپر کے کمرے اسوقت خالی پڑے ہیں یا ان میں بنچیں کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں پہلے وہاں مدرسہ کی جماعتیں تھیں اور ایک کمرہ امام مسجد کو ملا ہوا تھا جو وہیں رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تک بعض انگریزی خوان ہندوستانی مسلمان اس خدمت پر مامور رہے۔ مگر آجکل کوئی آدمی اس مطلب کے لئے مقرر نہیں +

انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کے بعد میں شیخ سے رخصت ہونیکو تھا مگر انکی مروت نے اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا کہ چند منٹ اور آپکی معیت میں گذار سکتا ہوں اور میرے ساتھ ریل تک مجھے پہنچانے آئے۔ رستہ میں لورپول کا بڑا بازار اور ٹاؤن ہال بھی انہوں نے مجھے دکھایا۔ اور اسکے بعد پھر لورپول آنے اور انکے ہمراہ انکے مکان پر چلنے کی تاکید کر کے رخصت ہوئے +

پھولوں کی تعریف میں

جناب نواب سراج الدین احمد خان صاحب سائل دہلوی کا یہ قطعہ شائع کرتے ہوئے یہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ نواب صاحب موصوف کو یہ قطعہ لکھنے کا خیال ان نظموں کو دیکھ کر پیدا ہوا جو منشی محمد عنایت اللہ صاحب کے ترجمہ نظم لارڈ لٹن پر لکھی گئی تھیں اور مخزن میں شائع ہو چکی تھیں تاہم انہوں نے اس قطعہ میں اپنے خاص رنگ کی اتنی خصوصیات بھر دی ہیں۔ کہ یہ سب پہلی نظموں سے الگ ہو گیا ہے۔ اس میں پھولوں کی تعریف جس شرح و بسط کے ساتھ کی گئی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ اشعار میں تغزل سے کام لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مدح ممدوح کا سلسلہ اول سے آخر تک قائم رہا ہے اس نظم میں قصیدہ کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی کثرت کے باوجود زبان کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس پر مبالغہ سے بالکل بچے ہیں۔ امید ہے اہل نظر ان سب باتوں کی داد دیں گے +

باغباں کی جائی جسکی دونوں بیٹیں ہیں ہم — گھر سے نکلی پھول لے کر بیچنے بازار میں
ہاتھ میں لکڑی اٹھی سر پر سبد گل کا دھرا — کہہ رہی ہے سہرے لو یا ہار لو بازار میں
مجھکو دیکھو رحم کے قابل ہے میرا حال زار — ہو اگر حس بصارت دیدۂ بیدار میں
پھر مری محنت مری ہمت کو دیکھو روز روز — گھر سے پھولوں کے لیے جاتی ہوں میں گلزار میں
انکا چننا سہل کچھ مجھسے اپاہج کو نہیں — ٹہنیوں میں الجھ جاتی ہوں کپڑے خار میں
الغرض لاتی ہوں میں ان دقتوں سے جنکے پھول — پھول بھی وہ جو شگفتہ تازہ تر گلزار میں
انکی دنیا باغ دولت خانہ ہے صحن چمن — انکی گنجائش قلوب کافر و دیندار میں

انکے شائق پیر و برنا انکے عاشق جن و انس　　شوق سے رکھتے ہیں انکو طرۂ دستار میں

فال نیک انکی خریداری کی نیت کا ہے نام　　یہ نہیں پہنچا کے بیٹھیں خدمت للہ میں

بیویوں کی بالیوں میں بھر کے بولوں کے ہار　　ہاتھ کے گجرے ہیں اور گویا گلے کے ہار ہیں

سر پہ دولہا کے بنا کر انکا سہرا باندھ دو　　دینے والے یہ نہیں ہیں یاں عنک گوہر بار ہیں

غنچۂ نشگفتہ ان کا ہے کلید قفل عیش　　انکا ہے فرمان جاری حسن کی سرکار میں

دخل ہے انکا حرم میں قبضہ انکا دیر پر　　در میں آ بیٹھیں ان اگر ہیں نقش ہی دیوار میں

لطف عشرت کا کبھی ہرگز نہو انکا قدم　　کار وہ کس کام کا ہے یہ نہوں جس کار میں

ہاتھ پھیلاتے ہیں ہنس کر اپنے بچے شیر خوار　　ان کی خواہش کا ہے طبع ناہشیار میں ہشیار میں

شہد کی مکھی کو دیکھو اپنے دل سے ہے فدا　　عندلیب خوشنوا لیکر پھرے منقار میں

یہ بھی لاکھوں طرح کی اپنے ہوتی ہے نثار　　باغ میں صحن چمن میں دامن کہسار میں

آنکھ پر رکھیے تو زیبا سر پہ گر رکھیے بجا　　یار انکا ہو نہیں سکتا ہے مخل بار میں

تندرستوں میں رہیں تو باعث سود و سرور　　روح بخشیں ہو گذر گر صحبت بیمار میں

انکی صورت جام جم سے متحد ہے کسقدر　　ملتے جلتے ہیں یہ گیتی ثابت و سیار میں

منہ لگا کر ان کو دیکھو بیشتر آتا ہے لطف　　اس مزے سے جو ہو حاصل بوسۂ دلدار میں

ان سے کھل جاتے ہیں کچھ رنگینیٔ قدرت کے راز　　چہرے انکے چڑھتے چھپتے ہیں دفتر اسرار میں

پالتے ہیں ناز سے ان کو نہالان چمن　　حسن کی دیوی کہو تو ہیں شریک اقرار میں

ہے زبان قاصر اگر کچھ وصف سوسن سے بیاں　　چشم جاناں کی ادا ہے نرگس بیمار میں

عارض جاناں میں ہے رونق انہیں کے نام کی　　لوگ کہدیتے ہیں گویا گل ہیں یہ رخسار میں

مسجدوں میں ہے انکی خوشبو مندروں میں انکی بو　　شیخ عمامہ میں رکھے برہمن زنار میں

ہیں مطبوع خلائق اتنے ان کے نقش بھی　　دل لبھاتے ہیں لگا دو جس جگہ دیوار میں

ہر جگہ انکی ضرورت ہر جگہ ہے انکا دخل　　میتوں پر مقبروں میں شادیوں کے کار میں

بیست ہیں مسافرت میں بعد مدت بار یہ | وہ عقیدت پوچھنا ہر انہیں جو آتے جاتے ہیں
صورت انکی بھولی بھولی پیاری پیاری تم ہم | ملتی جلتی ہے شباہت میں آتیا ہیں
سیرت ان کی روح افزا خوش کن و صحت فزا | جو صفت انہیں ہے وہ ہو کر کسی دوا میں
رنگ انہیں نہیں ہیں جو دوا کو نصیب | آنکھ ہم جیتے ہیں لیکن نیند آتی نہیں
بو میں بیشتر نکلی انکی خواستگار ہمیں ہی | یا الٰہی یار و دیر ہو انہیں یا رب
باوفا اتنے کہ کرتے جان تک کو بھی نثار | بار ہا ہیں جس کسی سے پیار میں دربار میں
تیل انکا گر نکالا تو نہیں اُن کو دریغ | عطر ان کے دیکھئے طب کے عطر میں
مغز میقوں کے اندر رہیں بنکر عرق | یہ دوا بنکر رہوں داخل نسخہ بیمار میں
خشک ہو کر انکی پتی جز مفرح کی بنے | نوش جان کرتے ہیں اکثر شکوہ کے بخار میں
یوسف کنعان گلشن انہیں ایک کہیے | ہاتھ خالی آکے کیا لیگا کوئی بازار میں
ہیں مرتبے یہ تمہارے نونہالوں کے یہی | جھوٹ کہتی ہوں تو کہہ دو تم بھی انکے پیار میں
وصف جو ہیں انہوں نے مجمل کہیں ہیں بیاں | سو ان کی جو ہمت کیسے کہ نہ رہ زار میں
نظم سائل تو نے لکھی خوب کیا کہنا تیرا | لیکن احسن ہے مزہ کم ہے تیرے اشعار میں

اقبال کا خیر مقدم

ہو مبارک حضرت اقبال آنا ہند میں | ہو مبارک آپ کو تشریف لانا ہند میں

یہ نظم جناب حکیم سید مہدی حسن صاحب احسن تخلص ہے جو متوطن لکھنؤ ہیں اور حکیم نواب مرزا شوق مرحوم کے نواسہ ہیں۔ ان کو ہر قسم کی نظم و نثر لکھنے میں ید طولیٰ حاصل ہے +

بنے ہو کر علم کی دولت سے مالا مال تم — بن گئے اقبال سے اب ڈاکٹر اقبال تم
ہو گئے کامل فلسفہ کے علم میں آپ ہی ہو تم — خوبیاں حکمت کی کیا کیا دیں میں بھر لائے ہو تم
اب یہ مرضی پر تمہاری ہے کہ بیرسٹر ہو — یا کسی کالج میں جا کر تم پروفیسر ہو
ہند پہ چھائی گھٹا او بارش نکبت کی ہے — اب ضرورت اس کو ایسے شخص کی خدمت کی ہے
بلند خوب ہو اقبال حالت اسکی تم — دیکھیں تم بھی کس طرح کرتے ہو خدمت اسکی تم
صرف اک پنجاب ہی تم پر نہیں نازاں یہاں — بلکہ ہو تم مایہ صد فخر کل ہندوستاں
قول ہے نظم ہمنے آپکی دیکھی نہیں — سچ تو یہ ہے اسکی فرصت آپکو بھی ہے نہیں
آپکی نظموں کے اک مدت سے ہم مشتاق ہیں — آپ فن شاعری میں شہرۂ آفاق ہیں
ہو فرصت آپکو تعلیم سے بھی ہوگی — پڑھیں گے تو ہم دیکھیں گے نظمیں آپکی

جو مخزن میں چھپیں گے آپکے اشعار بھی
دیکھیں گے ہم آپکے افکار گوہر بار بھی

برکھارت

چھائی ہیں کالی کالی گھٹائیں — چلتی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
دیکھ میں بلبل جھوم رہے ہیں — کیک چمن میں گھوم رہے ہیں
نتی ہے کس کی باد صبا اب — گل کو بتائے کیوں نہ ہوا اب
چلتی ہے اٹھلاتی ہر سو — پھرتی ہے اتراتی ہر سو
حسن برستا ہے گلشن پر — جوبن ہے خوبان چمن پر
پودوں نے پیلے پیلے کپڑے — پھینک کے بدلے دھانی جوڑے
سردی پہ چھوٹے چھوٹے قطرے — کیسی بہاریں ہیں دکھلاتے

پہنی ہے پگڈنڈی نے گویا — موتیوں کی اک بھاری مالا
طوطے شریفے پر آ بیٹھے — تو گرنے لگے ٹپ ٹپ قطرے
نیمو پر یوں فاختہ گائی — ٹیا پاک تو ٹی یا پاک تڑی
گاتی ہے بلبل ہنستی ہیں کلیاں — کیک ہیں شاداں مور ہیں رقصاں

بیٹھ کے شاخ سرو پہ قمری
ہے یہ غزل کیا جھوم کے گاتی

ہجر کی ایذا کب تک اٹھائیں؟ آ کے گلے سے لگ جا پیارے
دل پر چوٹ کہاں تک کھائیں؟ آ کے گلے سے لگ جا پیارے

ساون کی یہ کالی گھٹائیں اور یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
آہ کہاں سے تجھ کو لائیں آ کے گلے سے لگ جا پیارے

پہلے وہ شوخی اب یہ حیائیں پہلے وہ الطاف اب یہ جفائیں
بھاتی نہیں دل کو اف یہ ادائیں آ کے گلے سے لگ جا پیارے

خانۂ دل کو آج سجائیں - راہ میں تیری آنکھیں بچھائیں
پاؤں پہ گر کر تجھ کو منائیں - آ کے گلے سے لگ جا پیارے

ہائے کہاں تجھ شوخ کو پائیں - دل کی حالت کس کو سنائیں
تاب کہاں سے ضبط کی لائیں؟ آ کے گلے سے لگ جا پیارے

بوندیاں پڑتیں جھولا ہوتا - کوئی کجری گاتا ہوتا
دل کی لگی کس طرح بجھائیں - آ کے گلے سے لگ جا پیارے

وصل کی شب وہ تیرا اکڑنا - دم میں منانا ہنس دینا
یاد آتی ہیں ساری ادائیں - آ کے گلے سے لگ جا پیارے

ظلم کی آخر حد بھی ہے کوئی - دیکھ کلیجہ ہو گیا چھلنی

ہو چکیں اب بہتیری جفائیں آ کے گلے سے لگ جا پیارے

تجھ بن سونی سیج پڑی ہے ۔ من کی نگری اجڑی ہوئی ہے
تو جو بسائے دل میں دعائیں ۔ آ کے گلے سے لگ جا پیارے

سارا زمانہ خوشیاں منائے ۔ غیرت سر پہ خاک اڑائے
روتے کٹیں یوں ایسی فضائیں ! آ کے گلے سے لگ جا پیارے

آہا ! آہا کیا سماں ہے		دیکھ کے جس کو دل شاداں ہے
چھوڑ کے صوفی اپنی خلوت		بزم نکلا کہ دیکھے جشن قدرت
رند بھی نکلے اپنے گھروں سے		آنکھیں ملتے ۔ شور مچاتے
ایسی فضا برباد نہ جائے		ساقی کدھر ہے ؟ جام پلائے
ساغر مے کو منہ سے لگائے		تشنہ لبوں کی پیاس بجھائے
کشتی مے بو دی وہ دکھائی		اور بط مے تیر کے آئی

ساقی خموں کو کھول رہا ہے
مستوں کا طوطی بول رہا ہے

بوندیں لگیں پونڈی ہر سو		اڑ گئے سارے پنکھ پکھیرو
پانی برستا ہے چھم چھم چھم		چھت سے زمیں تک چھم چھم چھم
پانی کی دھاریں نو لکی جھڑیاں		موتیوں کی ہیں سیکڑوں لڑیاں
دلکش ہیں جھرنوں کی صدائیں		بلبلیں جیسے مل کر گائیں
سارے گڑھے اور پل اور نالے		بھر بھر کے ہیں اُبلے پڑتے
ندیاں جاری سڑکوں پہ ہر جا		وینس کا ہے ہو بہو نقشہ
بجلی کوندی ۔ بادل کڑکے		لڑکیاں کانپیں ۔ سہمے لڑکے
نالے اُبلے ۔ ندی چھلکی		بادل گرجے ۔ بجلی چمکی

آہا آیا چہرۂ دہقاں ہو گیا دیکھو کیسا درخشاں
ہنس ہنس کے سب ہل ہیں چلاتے بوتے ہیں دہقاں اور خوش ہیں گاتے
عیش کی دی جھڑیوں نے منادی
دہقان سب سمجھے نعمت شادی

سر جون مور کا جنازہ

نہ بانگِ دہل تھی نہ ماتم کا باجا چلا سوئے مدفن جب اُس کا جنازہ
تلنگوں نے بھی قبر پر اُس جواں کی وداعی کوئی توپ اُس دم نہ داغی

کسی طرح سنگین سے گھاس ہٹا کر لٹایا اُسے کنجِ مرقد میں لا کر
اندھیرا تھا اور رات تھی سنسناتی کرن چاند کی تھی کبھی جھلملاتی
دمِ واپسیں شمع بھی جھینپتی تھی عجب بیکسی تھی عجب بے بسی تھی

نہ تو اُس کا سینہ کفن سے چھپا تھا نہ جسم اُس کا چادر میں لپٹا ہوا تھا
مگر مثلِ شیرِ جواں وہ بیچارا تھا بیجان جنگی لباسوں میں سوتا

پڑھا فاتحہ مختصر ہم نے اُس دم کوئی لفظ افسوس بولے نہ وا غم
رہے غور سے دیکھتے اُس کی صورت یہ ڈر تھا کہ آتی ہے کل کون آفت

لحد کھودنے میں تھے مصروف جب ہم — سرہانے کو صاف اسکے کرتے تھے جب ہم
خیال اپنے دل میں یہی تھا گزرتا — کوئی اجنبی خواہ دشمن مبادا
حقارت سے لات اسکی سر پر نہ مارے — رہیں جب سمندر میں ہم لوگ سارے

اہانت کا لفظ اس کی نسبت کہینگے — اسے بالیقیں گالیاں بھی وہ دینگے
خیال اس جواں کو نہیں اس کا اصلا — اسے چھوڑ دیں قبر میں گر وہ سوتا

ہوا جبکہ کام اپنا انجام آدھا — بجا اس گھڑی کوچ کرنے کا گھنٹا
صدا توپ کی دور سے آرہی تھی — عدو کی جماعت جسے چھوڑتی تھی

لئے خون آلود میدان سے لاکر — رکھا ہم نے آہستہ مرقد کے اندر
نہ مصرع کوئی لوح تربت پہ کھودا — نہ سنگ لحد قبر پر اسکی رکھا
دیا چھوڑ تنہا وہاں سے چلے ہم — جہاں اس کی نام آوری تھی بہم

(مولوی محمد اسمعیل بی اے آرہ)

مرغابی

ڈھل گیا دن اور شبنم ہے زمیں پر قطرہ ریز — گوشہ مغرب میں گلگوں ہے شفق سے آسماں
ہیں ابھی تک دور تک سورج کی کرنیں زرد زرد — جا رہی ہے تو اکیلی شام کو اڑتی کہاں

دیکھتا ہے کیوں عبث صیاد سوئے آسماں — یا مری کی نظر دل سے تری شوکت پرواز کو

عنواں زارِ فلک کو منظرِ خوش رنگ نے — کر دیا ہی اور دلکش تیرے نقش نہ زر کو

ڈھونڈھتی پھرتی ہی کیا کوئی سہانا آشنا — یا کہ سرگرمِ تلاشِ دامنِ دریا ہے تو
سی بحرِ تموّج خیز کی ہے جستجو — یوں سکوتِ شام میں کیوں آسمان پیما ہے تو

وہ سنگِ نشانِ جادہ وہے مرحلہ — کر رہی ہی آسمان پر قطعِ طبقات ہوا
سکے بدرقہ تو ۔ یہ کہاں تیری مجال — کوئی طاقت ہی مگر تیری تقرر رہنما

سبک پروازیاں تیری سرعتِ پرواز نے — طے کئے کتنے ہی دن بھر سرد طبقاتِ نسیم
کے واماندہ زمین پر گر نہ شہپر جوڑ کر — شب کی ظلمت کا ہی گرچہ سر یہ طوفانِ عظیم

ملی تیری مشقت ختم تجھکو عنقریب — گرمیوں کا اک سہانا گھر ملیگا خوشگوار
ن ہوگی چھوٹی چڑیوں میں ہم آہنگی ہر تو — اور نشیمن پہ ترے ہوگی نیستاں کی بہار

ہی غائب فضائی آسمان میں گرچہ تو — اور اب آنکھوں میں ہے تیرا تصور یادگار
سیکھا ہی سبق لیکن تیری پرواز سے — ہے طریقِ زندگی میں تو مری آموزگار

طبقہ سے طبقہ تک ہی سبک پرواز شوق — وسعتِ اوجِ فلک پر ہے جو تیرا راہبر
مجھ کو بھی لیجائیگا وہ منزلِ مقصود تک — جب کرونگا جادۂ ہستی پہ میں تنہا سفر

(ترجمہ انگریزی) (سرور جہان آبادی)

غزلیں

دردِ دل گاہ تو گہ دردِ جگر ہوتا ہے — انکا بیمار اُدھر اور نہ اِدھر ہوتا ہے
ہاتھ سینے سے اِدھر اور نہ اُدھر ہوتا ہے — بعد مرنے کے بھی کیا دردِ جگر ہوتا ہے
دل میں پھر حسرتِ دلدار کا گذر ہوتا ہے — لو پھر آباد یہ اُجڑا ہوا گھر ہوتا ہے
دل پریشان ہے یاں بال جو بکھرے ہیں وہاں — سچ کہا ہے کہ محبت میں اثر ہوتا ہے
کروٹیں کون بدلتا ہے لحد میں اپنی — کس کے نالوں سے جہاں زیر و زبر ہوتا ہے
کیجئے بزم میں غیروں سے اشارے چشم و ابرو — ٹکڑے ٹکڑے انہیں۔ یاں تو مرے جگر ہوتا ہے
زلف و رخسار میں تصور سے نہیں باز آتا — ذکر اک شام کو اک وقت سحر ہوتا ہے
نہیں ڈھونڈ رہی ہیں ہمیں پھر پھر کے نگاہ — حالِ بیمار کا اب نوع دگر ہوتا ہے
صبح کو یاد تیری شب کو تصور تیرا — میہمان ایک نہ اک شام و سحر ہوتا ہے
بس یہی کہکے زباں بند ہوئی نزع کے وقت — تم بھی اب جاؤ ہمارا بھی سفر ہوتا ہے
جھلملاتے ہیں ستارے بھی چراغوں کی طرح — مجھسے رخصت کوئی ہنگام سحر ہوتا ہے
ہاتھ رکھکر مری سینہ پہ وہ فرماتے ہیں — اب بتاؤ کہ کہاں دردِ جگر ہوتا ہے
سنتے کب ہیں کوئی بات محبت والے — سنتے ہیں مگر دھیان اودھر ہوتا ہے
انکے زخموں کی جو ٹوٹینگے تو موت آئیگی — مجھکو ہنسنے میں بھی اسطرح کا ڈر ہوتا ہے
بدرقِ جنبشِ مژگاں کے اشارے سے یہ کہہ — خیر اب چلتے ہیں دنیا سے سفر ہوتا ہے

سید کاظم حسین بدرقِ لکھنوی

ماہ تیرا اگر جواب نہیں — مہر کو ہمسری کی تاب نہیں
کیا ہے ہستی اگر یہ خواب نہیں — کیا ہے عالم اگر سراب نہیں۔

یں ہو نبات ہو یا قند — تیری گفتار کا جواب نہیں
ں داغ لالہ جس سے بجھے — کوئی بوند ایسی اے سحاب نہیں
ی ہے ادائے گل رو کی — ہیں سبھی یا لاابالی خطاب نہیں
لم اس کی چال مستانہ — رستی چلنے کی مجھ میں تاب نہیں
ئے جھوٹے شکوے سچے مرے — تیری باتوں کا کچھ جواب نہیں
ست دیکھی ہے اس کی یاری گل — چشم پرنم میں اپنی خواب نہیں
تقصیر کی ہے ان سے امید — اور خطاؤں کا تو حساب نہیں
ری ہیں مدتیں تڑپتے ہوئے — دل میں وہ جوش اضطراب نہیں

اپنی زلفیں سنگھاؤ خضر کو
بے خودی کی دوا گلاب نہیں

ر لبوں سے نکلے جو دو حروف پیار کے — بوسے مری زبان نے لئے نطق یار کے
شباب رنگ سے دن آئے نکھار کے — گل باغ آرزو میں کھلے ہیں بہار کے
، نہ ہو حوصلے دل امیدوار کے — لوٹے لٹیری گلی میں قدم اختیار کے
ایاب ہو گئی ہے مری صبح آرزو — پردے پڑے ہوئے ہیں شب انتظار کے
لے زمین پہ ہیں تڑپ آسمان پر — نالوں میں ہیں یہ رنگ ہیں برق و شرار کے
ے جنوں [illegible] رنگ ہے کہ ہوگئے زخم دل — کپڑے ملے خزاں کو بھی فصل بہار کے
لا کے تم نے خاک کو رتبہ بڑھا دیا — گردوں پہ اب دماغ ہیں مشت غبار کے
ل جنوں میں [illegible] بن نشتر بن گئے — انداز میرے چھالوں میں ہیں نوک خار کے
اہوں صفحہ گریہ [illegible] — جھگڑے پڑے ہوئے ہیں [illegible] کے
ہو کے رنگیں دل بلبل کی سرخی — [illegible] گل مری [illegible] مزار کے

لے چل صبا عدم میں تو ہی مجھ نحیف کو احساں کیوں اٹھاؤں بیمار گور
یہ خنجر جگر جتنا ہوا خنجر جگر پہ چلنے دست نگار

میرن صاحب

رنگِ سخن ہمارے ہے رونق یہ سرسری
لکھتے نہیں غزل کبھی ہم زور مار کے

منشی پیارے لال رونق صاحب
تلمیذ جناب نسخہ صاحب

نگاہوں میں شبِ غم سرمۂ چشمِ حسیناں تھا
خیالِ آہوئے مشکیں مرا دشت میں جولاں

خیالِ خالِ مشکیں جلوہ زیباشاد بجا تھا
سر طاق خم ابرو جمال اپنا ایمان

دلِ شیدا ہی کس رونق پہ ایجاں شامِ ہجراں تھا
ہجوم یاس کا بازار تھا سودے میں سودا

پریشان ہے عالم
کہ شعلہ شمع کا نازش کے پردے میں عریاں

پڑا جاگ گیا
کہ ہر آنسو مرے دل کا گنہگار از نہاں

جو پوری وہ کی ہی بزمِ عالم
نگاہیں جس طرف کو اٹھ گئیں گنج شہیداں

پسِ مردن کھلا احوال شمع کا ہی ہو کا تھا
خیال ہستی نہیں اک خواب پریشاں

مری تردامنی سی بحرِ عصیاں پانی پانی ہے
کہ جو قطرہ گرا اشکِ ندامت کا وہ طوفاں

شبِ غم کی بھی شادی سی حکایت عجب رنگیں
کہ ہر شاخ ثمر پر خونِ دل اک گلستاں

یہیں پر چلی کا بزم میں میٹھی چھری بنکر
کہ غمزہ آنکھ کے پردے میں بھی شمشیر عریاں

پری زادوں کا جھرمٹ ہر فقیری میں
تمہارا بوریا بھی رونقِ تختِ سلیماں

(بابو چندی پرشاد شیداؔ)